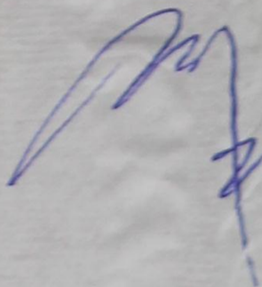


AEKSE AAINA

G. M. Gousi

عکسِ آئینہ

وہ آئینہ ہیں اُن کا عکس غوثیؔ
کوئی پردہ کوئی دوری نہیں ہے

غوث محمد غوثیؔ

یہ شعری مجموعہ فخرالدین علی احمد کمیٹی کے گراں قدر مالی تعاون سے شائع ہوا۔

تعداد ــــــ چھ سو

کتابت ــــــ سراج رسولپوری

طباعت ــــــ جے۔کے۔ آفسٹ پرنٹرز، دہلی

ملنے کے پتے :

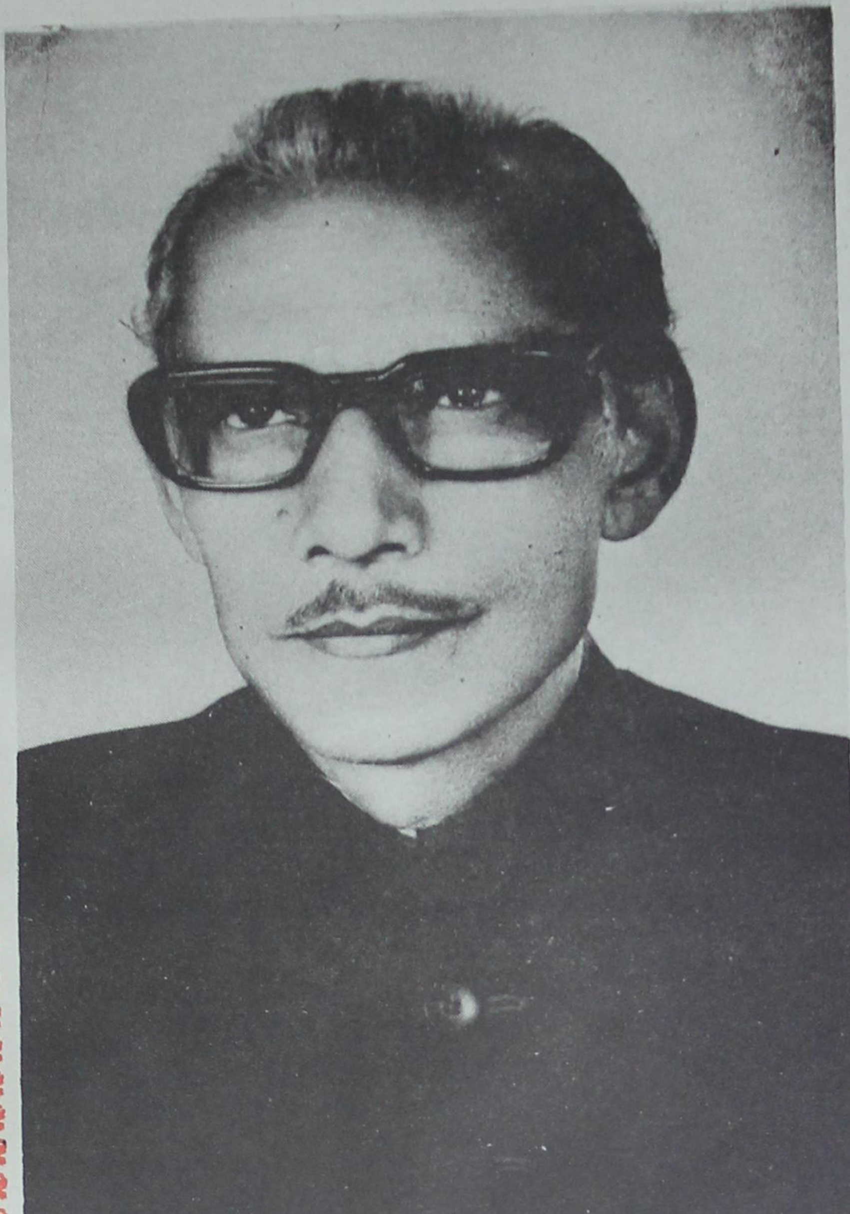
۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

۲۔ غوث محمد غوثی، بی ۔ ۲ ۔ سر ارحمن، علی گڑھ۔

شہرِ علم

کے نام

فہرست



غوث محمدؔ غوثیؔ

احوالِ واقعی

۱۹۲۷ء میں ایک متوسط تجارتی خاندان میں پیدا ہوا قبلہ والد صاحب ٹھیکیدار نور محمد خاں نے غوث محمد نام رکھا، تیرہ چودہ سال کی عمر میں استاد شبیر جیلانی جو کہ استاد قمر جلالوی کے شاگردِ رشید ہیں اور میرے نسبتی بھائی بھی تخلّص "غوثی" تجویز کیا۔ چند سال مشقِ سخن اور رموزِ شاعری سے واجبی واقفیت میں گزارے، اُس وقت علی گڑھ نیز اطراف کے شعراء کا مزاج روایت پسندانہ تھا لیکن میری افتادِ طبع ماحول کے اثرات تادیر قبول نہ کر سکی اور ایک ایسا لب و لہجہ جسے "توسیع روایت یا جدیدیت" کہہ لیجیے، جو فطری طور پر مجھ میں رچا بسا ہوا تھا میری ابتدائی تخلیقات میں جھلکنے لگا تو اس رنگ و آہنگ کی حوصلہ افزائی کے خیال سے استاد موصوف نے غیر اصلاحی اشعار پڑھنے کی اجازت دے دی۔

غزل میری پسندیدہ صنفِ سخن ہے، ہر چند کہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ میری شاعرانہ زندگی میں نامساعد حالات کے تحت کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کئی کئی سال تک جمود کا شکار رہا ہوں۔ زیرِ نظر مجموعہ کے ابتدائی حصّے میں شروع کے دس بارہ سال کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جس سے قارئین کو میرے ارتقائے فکر کا بتدریج جائزہ لینے میں آسانی ہوگی۔

"عکسِ آئینہ" میری تخلیقات کا کل سرمایہ نہیں ہے (بہت کچھ تلف ہو چکا ہے) مگر نقشِ اوّل کے اعتبار سے اس کی اساسی حیثیت میری نظر میں وہی ہے جو ایک فنکار کے لئے اپنے شاہکار کی ہوتی ہے۔ میرے لئے یہی بہت ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر اور

میاں نسیم نوری کی پُرخلوص تحریک پر مقامی شعراء میں پہلا شعری مجموعہ پیش کرنے کی سعادت مجھ ہی کو حاصل ہوئی۔

میں ربّ العزت کا شکر گزار ہوں کہ مجھے ہر دور میں ایسے سخن فہم حضرات ملے جن کی سخن فہمی کی قسم کھائی جا سکتی ہے مثلاً علامہ خیر بہوروی، علامہ یونس خالدی، مولانا ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر آل احمد سرور، جناب اختر انصاری، جناب نسیم قریشی، جناب مینا زبیری، جناب معین احسن جذبی، ڈاکٹر مسعود حسن ذوقی، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر ابنِ فرید، ڈاکٹر وارث کرمانی، جناب مختار ہاشمی (آنولوی) غیر منقسم ہندوستان کے تقریباً تمام مقتدر شعراء کرام نے نہ صرف مجھے شوق سے سنا بلکہ اپنے ذاتی علم کی روشنی میں ان حضرات نے مجھ بے بضاعت کی ہمت افزائی بھی فرمائی۔

اِس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ میں کوئی دعوئ فن کر رہا ہوں، میرے کلام میں بشریت کا خاصّہ ضرور نظر آئے گا جس کی تمام تر ذمہ داری صرف میری ہے۔

میں متشکّر ہوں ان تمام بزرگوں اور مخلصین کا جن کی دعاؤں کا ثمرہ مجھے ہمیشہ ملا ہے اور وہ ہیں مثلاً اکبر ثانی الحاج حافظ عبدالحمید جاذب، امینِ فن امانت اللہ اسیر، محمد ناصر انجم، ڈاکٹر فوق کریمی، ڈاکٹر معظم علی خاں، ڈاکٹر اظہار الحسن، عبدالمعبود خاں تاج، عزیزی فضلِ عباس، سید مشکور نقوی، شہپر رسول، یونس آزاد، سید شوکت علی حیرت، سید مقصود علی تاج وغیرہم۔

مجھ پر واجب ہے اظہارِ ممنونیت ان مقتدر اہلِ قلم کا جنہوں نے اپنے گرانقدر اور بصیرت افروز مضامین سے مجھے بروقت نوازا۔

میری خوش نصیبی ہے کہ انتخابِ کلام میں کئی صاحب طرز گرامی قدر شعراء کا تعاون مجھے حاصل ہوا جیسے علیم عارفی محشر چھتاروی جو ہر رنگ میں شعر کہنے پر قادر ہیں۔ جناب غلام مرتضیٰ راہی جو نئے رنگ و آہنگ کے دو شعری مجموعوں کے خالق ہیں جناب رمز آفاقی جن کو علمِ عروض پر خصوصی دسترس ہے اور گنوّر کے ممتاز شاعر ہیں نیز استاد زادہ محمود طالب (ایم۔ اے) جو اعتدال پسند نوجوان شعراء میں ممتاز ہیں۔

میں ممنون ہوں ان مخلصین نیز شعر فہم احباب کا جو وقتاً فوقتاً مجھے اپنے مشوروں سے نوازتے رہے ان میں خصوصیت سے جناب قیوم عطا، جناب شفیق اکبر آبادی، جناب ماسٹر معراج، سید افتخار زیدی، بھائی رفیق احمد اور محمد ایوب خاں قابلِ ذکر ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں محترم خواجہ عبدالحلیم صاحب (ایم۔ایل۔اے) کے لئے بطورِ خاص اظہارِ ممنونیت نہ کروں کہ موصوف نے ازراہِ ادب نوازی اس مجموعہ کی اشاعت میں اپنے قیمتی مشوروں نیز تعاون سے نوازا۔

چلتے چلتے ان کرم فرما حضرات کا بھی شکریہ ادا کردوں جنہوں نے ایک مخصوص و محدود حلقہ میں سہی میرے کلام کو ہدفِ تنقیص بنایا، انہوں نے اپنے محبوب مشغلے کے عوض کیا کھویا کیا پایا یہ وہ جانیں لیکن ان کی اِن نوازشات نے میری خود اعتمادی کو مزید تقویت ضرور بخشی۔

غوث محمد غوثی

میری نظر میں

پدم شری عالیجناب پروفیسر قاضی عبدالستّار صاحب

(شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

جذبی اور اختر انصاری (دہلوی) کے بعد علی گڑھ کے تیسرے بڑے شاعر کا نام غوثی ہے۔ اس دعوے پر یہ حجت لائی جا سکتی ہے کہ مشہور نہیں ہے۔ شہرت وہ حق ہے جو کبھی کبھی حقدار کو بھی دیر سے ملتا ہے۔ غوثی اس دیر رسائی کی بہترین مثال ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ غوثی دانشکدۂ علی گڑھ سے براہِ راست وابستہ نہیں ہیں اور دانشکدوں کی بلند حیسی ضرب المثل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ خود اپنی خاکساری اور عصری گروہ بندیوں سے بے نیازی کی آپ سزا ہیں، تاہم، ایک طبقہ ہے جو اپنی علمی برگزیدگی اور ادبی برتری کے باوجود غوثی کے فن کا قائل ہے۔

مشکل زمینوں، ٹیڑھی بحروں، ترچھی ردیفوں اور آڑے قافیوں کے باوجود غوثی نے ایسے سبک، سجل، سلوتر اور خیال انگیز شعر نکالے ہیں کہ مہارتِ فن ہاتھ چوم لیتی ہے۔

غوثی کی فنی اساس کا دوسرا پہلو عصری حسیت کا وہ شعری اظہار ہے جسے بوالہوس بے آبرو کر چکے ہیں۔

غوثی کے فن تک رسائی مشکل ہے جب تک قاری تغزل کی روایت سے آشنا اور اپنے عہد سے باخبر نہ ہو۔

مجھے امید ہے کہ اس مجموعۂ کلام کی قرأت سے آپ خوش وقت بھی ہوں گے اور خوش اندیش بھی کہ اِس زمانے کا شعر ان دونوں برکتوں سے محروم ہونے لگا ہے۔

۱۹۸۴ء

قاضی عبدالستّار

تعارف

عالیجناب ڈاکٹر وحید اختر صاحب

پروفیسر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

غوثی پہلے شاعر ہیں جو صدفی صد علی گڑھ شہر کے زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ شعری مجموعوں کی دنیا میں علی گڑھ کے دبستانِ شعر کے پہلے نمائندے کی حیثیت سے خود کو اور علی گڑھ کو روشناس کرا رہے ہیں (ان شعراء میں خصوصیت سے جنھوں نے مجھے، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار اور دوسرے بزرگ شعراء مثلاً اختر انصاری (دہلوی) کو اپنی طرف متوجہ کیا، ان میں غوثی کو نمایاں انفرادیت حاصل ہے۔

غوثی کی شاعری میں روایت کے احترام کے ساتھ نئے تجربوں سے آگاہی بھی ملتی ہے، عصری مسائل کا شعور بھی، تجربۂ ذات کے تخلیقی اظہار کا ملکہ بھی۔ اس طرح وہ قدیم و جدید کا نہ صرف سنگم ہیں، بلکہ ان دونوں دھاروں کے امکانات سے باخبر بھی ہیں۔ اس امتزاج نے ان کے اشعار میں ندرت و تازگی کے ساتھ زبان کی روایتی حرمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انفرادیت کی شان پیدا کر دی ہے۔ میرے نزدیک ان کی غزل کسی طرح بھی آج کی جدید غزل اور اس کے محاورے سے ناآہنگ نہیں ہے۔ یہ امتزاج نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

جدید شاعری خصوصاً غزل میں گزشتہ چند برسوں میں کربلا سے متعلق استعارے و علایم جیسے فرات، نیزہ، بریدہ سر، مقتل، زنداں، عام ہو گئے ہیں۔ نئے شعراء میں افتخار عارف کا مجموعہ کلام اور عرفان صدیقی کی نظمیں، غزلیں بیشتر ان استعاروں سے مالا مال ہیں۔ یہ دونوں سُنّی المشرب ہیں۔ جدید شیعہ شاعروں نے ان استعارات کا خصوصیت سے استعمال کیا ہے لیکن کربلا کے تلازمی استعارات تقریباً پندرہ برس قبل جبکہ کربلا کے تلازمات جدید غزل اور شعری محاورے میں کم یاب تھے، میں نے ایک نشست میں غوثیؔ کا یہ شعر سنا ؎

لبِ فرات عجب شانِ سرفرازی تھی
گماں تھا، دشت میں نیزوں کے سر نکل آئے

میں چونک گیا کہ یہ تو بالکل نئے لب و لہجے اور انداز میں کربلا کے استعارے کا خلاقانہ استعمال ہے۔

غوثیؔ کی غزلیں معیاری ادبی جرائد میں شاذ ہی شائع ہوئی ہیں اس لیے ان کی اولیت کی ہماری نئی شاعری کے قارئین و ناقدین کو خبر نہیں۔ لیکن میں اپنے مطالعہ کی بناء پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کربلا کا تخلیقی، استعاراتی اور خلاقانہ استعمال کرنے والوں میں غوثیؔ اولین شعراء میں ہیں۔

اسی طرح کی اور خصوصیات آپ کو ان کے مجموعے کے مطالعہ کے دوران میں متاثر کریں گی، ان خصوصیات کی تلاش و تحسین کا کام میں قارئین و ناقدین کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔

۷ مارچ ۱۹۸۴ء (ڈاکٹر) وحید اختر

ایک اور نئی آواز

عالیجناب سید رفیق عزیزی صاحب۔ بی اے (آنرز) علیگ

(بارگاہ ادب، کراچی ۲۸)

شعر گوئی کی جنم بھومی ذہن انسانی ہے اور شعر کی عصمت و طہارت اور نجابت سے شاعر کے فکری، عملی اور علمی پیکر کی عصمت و طہارت اور نجابت کا شجرہ بآسانی مرتب کیا جاسکتا ہے۔

شعر بالخصوص غزل کا شعر، اپنے خالق (شاعر) کے پورے وجود کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کے قول و فعل میں اگر نفاق اور تضاد ہو تو وہ کسی نہ کسی دن اس نفاق و تضاد کو فاش کر دیتا ہے۔ دراصل یہی وہ راستہ ہے جس سے اہلِ نظر (کلام سے) کلیم کے نہاں خانۂ احساس تک جا پہنچتے ہیں۔

ہماری اردو شاعری میں بے شجرہ باتیں کرنے اور علم و حکمت سے فرار کے لیے شعراء نے "ترقی پسندی" کا نعرہ جب وضع کیا تو اس کی لاغر اندامی سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ اس لنجی لنگڑی ایجاد کے لیے کچھ بیساکھیوں کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اپنی اس خیالی بارات کے اپاہج نوشہ کا ایک "شہ بالا" بھی وضع کیا گیا اور اسے روایتی شاعری، جدید شاعری اور جدید تر شاعری جیسے مزعومہ لباسوں کی پیٹی تھمادی ـــ یہ تمام صورتِ حال "حقائق" سے انکار کے لیے پیش آئی، حالانکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ "حقائق" کے لیے "فرسودگی" کا فتویٰ کسی طور پر درست نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ جنگ اور امن، خوف اور بے خوفی، راحت اور الم، زندگی اور موت، ہجر اور وصل، حسن اور عشق، زمین اور آسمان، بے آب وگیاہی اور سیرابی، سیرابی اور شادابی — سب وہ حقیقتیں ہیں جو ازلی ہیں، ابدی ہیں اور یہ حقائق آفرینشِ عالم سے کسی دور میں ایک لمحے کے لیے بھی معطل نہیں رہے۔ یہی وہ صفت ہے جس کی وجہ سے اہلِ فکر اور صاحبانِ شعور کے لیے یہ حقائق مرکزِ توجہ رہے ہیں۔ فرسودگی، روایتی، رجعت پسندانہ اور ایسی ہی بہت سی خرابیاں گنواتے ہوئے مدعیانِ ترقی پسندی جب سامنے آئے تو یہ بات بھول گئے کہ "جدت" کے معنی "حقائق" کو بدل ڈالنے یا ان کا انکار کر دینے سے ہرگز نہیں ہیں۔ "جدت" کے معنی یہ کیوں کر وضع کیے جا سکتے ہیں کہ ان حقائق کو بدلنے کی بیکار کوشش میں انسانی قیمتی وقت ضائع کیا جائے۔ جدت کے چوگان میں صرف اسی قدر وسعت ہے کہ ان حقائق کو جو ازلی و ابدی ہیں، تازہ سے تازہ، نئے سے نئے انداز میں بیان کیا جائے۔ فخرِ علی گڑھ، غوث محمد غوثیؔ کا کلام اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

شاید یہ ضربِ سنگِ صداقت نہ سہہ سکے — شاید یہ تیرا شیش محل "کل" کھنڈر ملے
کنکر تو میرے پاؤں کے چھالوں نے چن لیے — شیشے کی طرح کیوں نہ تری رہگزر ملے

یا

دیدۂ ذہنِ رسا سے تو نہیں چھپ سکتی — صورتِ دل جو پسِ لفظ و بیاں ہوتی ہے

یا

دنیا میں جو امرت ہے، اہل بانٹ کے پی جاؤ — ہم وقت کے "شنکر" ہیں، پی جائیں گے سم تنہا

یا

وہ آندھیاں ہیں کہ سینے ہیں شق پہاڑوں کے — ترا کرم ہے کہ ذرّوں کی ہے ہوا بستہ

یا

فراتِ میکدۂ تشنگی ہوا ثابت — وہ رہگزار کے ساغر میں ایسی ڈھال گیا

یا

دور سے جو تمہیں شیشے کا مکاں لگتا ہے
کیا تعجب وہ چٹانوں سے بھی لیتا ہو خراج

غوثی بڑی اُپج اور طباع ذہن کے شاعر کا نام ہے۔ گنجائش تفصیل سے اس کے محاسن بیان کرنے کی نہیں ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "حقائقِ کونیہ" کے بیان میں انفرادیتِ بیان اس کے کلام کا حسن ہے۔ اس کے یہاں لفظوں کے دروبست، ان کے برمحل استعمال، طرزِ احساس میں ذکاوت و طباعی، تازہ تر تشبیہات و استعارات اور اپنے وطن کی منفرد تلمیحات کو بھی سلیقے سے برتنے کا اعتماد جگہ جگہ ملتا ہے۔ جدت کے ترقی پسندانہ جنون میں اس کا شعر کسی قسم کی مذہب بیزاری، آفاقیت اور بے شجرہ بات کہتا نظر نہیں آتا۔

غوثی ایک ایسا وہبی شاعر ہے جو اپنے تجربوں، اپنے وجود اور اپنی ذات (حقیقت) کے حوالوں سے کائناتِ ظاہری اور اس ظاہر کے باطن یا حقیقت الحقائق کی معنویت کا متلاشی ہے، اسے اپنے رویّہ پر ناز ہے۔ اس لئے کہ نفرت و عداوت، شقاوت و آزار پسندی کے مقابل اس کے سینے میں محبت کا بحرِ زخّار پوشیدہ ہے۔ دیکھئے:

ہر چند ابھی خود پر ظاہر، میں اور مرے احباب نہیں
یاروں پہ فدا ہونے والے کمیاب سہی، نایاب نہیں
دنیا کا بھرم قائم رکھنا، اوروں کے لئے جینا مرنا
اس دور کی وہ تہذیب نہیں، اس دور کے وہ آداب نہیں

غوثی بنیادی طور پر غزل گو ہے اور غزل حقائق کی اس ترجمانی کو کہتے ہیں جو انسانی فطرت میں اجمالاً مضمر ہے اور کائنات میں تفصیلی ظہور سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ پیکرِ انسانی میں اجمالاً ساری کائنات جمع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر جب اپنی اجمالی فطرت کے بیان کے لئے اندازِ بیان اجمالی اختیار کرتا ہے تو اصل میں فطرت کا ترجمان ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے مقالے وہ کام

نہیں کر سکتے جو ایک شعر سے انجام پا جاتا ہے۔ وجدان اور یقین کی سرشاری تو دیکھیے:

فضائے دار میں سب لوگ آخر کیوں ہراساں ہیں
یہاں تو اہل جو ہوں گے، ان ہی کے امتحاں ہونگے

طلوعِ آفتابِ آگہی کیا خاک دیکھیں گے
حقارت سے مرا چاکِ گریباں دیکھنے والے

فرازِ دار ہو یا طورِ سینا
محبت تو بلندی چاہتی ہے

وہ آئینہ میں ان کا عکس غوثی
کوئی پردہ، کوئی دوری نہیں ہے

بخشا ہے جنہیں جذبۂ خوش پروازی
وہ ان کو پر و بالِ ہما ہی دے گا

غوثی کا اندازِ فکر دراصل ایجابی ہے۔ خیر کے تمام پہلو اور گوشے اس کی شاعری کا وظیفہ اور مرکزِ امتیاز ہیں۔ شاعر کو یہ وسعتِ فکر و بیاں اسی وقت میسر آتی ہے کہ اس نے آبشارِ محبت سے اپنی پیاس بجھانے کا رشتہ قائم کر لیا ہو اور محبت اس کی روح میں رچ بس رہی ہو۔ مثلاً:

جس نے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی ہے
وہ مرے درد کے رشتے سے مرا بھائی ہے

درد کے رشتوں پہ کب قائم تھے احبابِ کرام
پاسدارِ رشتۂ زنجیر شاید میں ہی تھا

حق گوئی پر ہوں راندۂ درگاہِ دوستاں
میری وفا کا ناگ ہی خود مجھ کو ڈس گیا

یا

ترے نقوشِ در و بام رنگ مانگیں تو
ہیں اپنے قلب و جگر، دجلہ و فرات لئے

یا

وہ حبس تھا کہ سانس بھی لینا محال تھا
ہلکی سی کچھ ہوائے محبت چلی تو ہے۔

یا

ان کے ذہنوں پہ جمی برف نہ پگھلے شاید
جن کے گھر میں نہ کسی گھر کا دھواں تک پہنچے

دراصل غوثی صاحب کا کلام تفصیلی بات چاہتا ہے اور صفحات میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ انشاءاللہ قارئین مجھ سے متفق ہوں گے۔

سید رفیق عزیزی (علیگ)
۲۲ مئی ۱۹۸۴ء

کہتا ہوں سچ کہ.....

عالیجناب ڈاکٹر بشیر بدر، اُستاد شعبۂ اردو

میرٹھ کالج، میرٹھ

"غوث الادب" غوثیؔ نے جس شعری ریاضت سے غزل میں اپنی عمر گزاری ہے وہ ایک مثالی داستان ہے۔ دانش گاہِ علی گڑھ کی وجہ سے اردو ادب کی جادوداں شخصیت علی گڑھ شہر سے بھی متعارف ہوتی رہی ہیں۔ ایک زمانے میں جب نوح ناروی، جگر مرادآبادی، پنڈت لبھوناتھ جوشؔ ملسیانی، آل احمد سرور اور خلیل الرحمن اعظمی وغیرہم، علی گڑھ کے تاریخی مشاعروں کی زینت ہوا کرتے، تو شہر کی نمائندگی غوثیؔ صاحب ہی کرتے تھے۔

نوح ناروی، اصغر گونڈوی، فانیؔ اور حسرتؔ نے غزل کے جس اعلیٰ معیار کو قائم کیا تھا، اس معیار کو جدید عہد کی بدلتی ہوئی غزل کے موضوعات، روایتوں اور تازہ کار لہجوں کے ساتھ غوثیؔ صاحب نے اس طرح اپنے فکر و فن میں سمویا ہے کہ ان کی غزل قدیم و جدید غزل کا باوقار نمونہ نظر آتی ہے۔ ان کی قادر الکلامی کا اظہار کئی ایسی غزلیں ہیں۔ (مثلاً وہ غزل جس کی ردیف "فرزانگی"، "دیوانگی" یا "تو میں نے دیکھا"، "تو میں نے سمجھا" ہے) جو اپنے اسلوب اور ٹیکنک کے لحاظ سے ہمارے عہد کی معنی خیز غزلوں میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بشیر بدر

۱۹۸۴ء

پیش لفظ

عالیجناب ڈاکٹر مُظفّر حنفی صاحب

(شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵)

اُس وقت سے، جب جدیدیت کے اکھوے پہلے پہل پھوٹ رہے تھے، میں بہ بانگِ دہل کہتا آیا ہوں کہ جدید بننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم ہو کہ پرانا کیا ہے۔ اصطلاحوں میں بات کرنی ہو تو کہہ لیجیے کہ روایت سے مکمل آگہی کے بغیر جدیدیت کا تصوّر ہی محال ہے۔ اوّل اوّل اس بات پر بہتوں نے ناک بھوں چڑھائی اور اس خاکسار کو جدیدیت کے زمرے سے خارج کر دینے کی دھمکیاں بھی دی گئیں، لیکن مقامِ شکر ہے کہ آگے چل کر سلیم احمد (مرحوم) اپنے مضمون "کچھ روایتی غزل کے بارے میں" اس خیال سے اتفاق کرتے نظر آئے اور شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کئی مقامات پر اس بات کی تائید کی۔ دوسرا نکتہ جس پر مجھے کم و بیش ربع صدی سے اصرار ہے، ابہام، اہمال اور ابلاغ کے فرق کا ہے۔ میرے خیال میں 'مفہوم در بطنِ شاعر' والی صدیوں پرانی پھبتی آج بھی حقیقی فن کار کے لیے دشنام سے کم نہیں۔ شعر کی تہہ داری اور پہلو داری متقدمین کے نزدیک بھی مستحسن تھی اور آج بھی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اہمال شعر کو منہ بند بناتا ہے اور ابہام اس میں پرتیں پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ ابلاغ کی وسعت میں اضافے کے لیے ابہام ایک کارآمد حربہ ہے

اور اہمال اس کے لیے سدِّ راہ کا کام کرتا ہے۔

یہ تمہید غوث محمد غوثیؔ کے مجموعۂ کلام کے پیش لفظ میں یوں اٹھائی گئی ہے کہ غوثیؔ اپنی شاعری میں اسی راہ پر گامزن ہیں۔ وہ خود کو روایتی ماحول کا پروردہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتے اور زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار سے روگردانی بھی ان کے تئیں نامناسب ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسی گُھر کی باتیں جاننے والے فنکار کے لیے بابِ قبول ہر دور میں کھلا رہا ہے۔ غوثیؔ نے مبیّنہ روایتی ماحول سے زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں کی نبض شناسی کا ہنر سیکھا ہے۔ روزمرّہ اور محاورے کو مہارت کے ساتھ برتنے کا سلیقہ حاصل کیا ہے، لفظ کو مرصّع ساز کے نگینے کی طرح شعر میں مناسب جگہ جڑنے کی تربیت حاصل کی ہے اور عروض کے پتلے تار پر سلامتی کے ساتھ گزرنے کا گُر سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایسے شعر بھی جو خالصتاً روایتی ہیں، اپنی ایک شانِ دلربائی رکھتے ہیں۔ ذرا دیکھیے:

اُن کی نظروں کا تو مفہوم سمجھ لیتا ہوں
لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں تو دیوانہ سہی

ساقی نہ اٹھا پردے چہرے سے حقیقت کے
ہم کو نہ ملا ہم سے، رہ جائیں گے ہم تنہا

وقت کی مصروفیت کے باوجود اے جانِ جاں
لو لگا کر ذکر کر لیتے ہیں پَل دو پَل ترا

دیے ہیں غم محبت کی ہنسی نے
بہار آ کر یہ کانٹے بو گئی ہے

خلوصِ دوستاں پر بھی ہیں سائے بدگمانی کے
قیامت ہے، اندھیرے روشنی کو کھائے جاتے ہیں

عام طور پر ایسے شاعر، جو مندرجہ بالا قسم کے سلیس، شستہ، برجستہ، گھلاوٹ اور رچاؤ کے حامل اشعار کہہ لیتے ہیں، پھر کسی اور طرف کم دیکھتے ہیں اور انجام کار ان کا نام کہیں کسی تذکرے یا جائزے میں محفوظ ہو کر رہ جاتا ہے۔ غوثیؔ نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرلیا، اپنے ذہن و دل کے دریچے تازہ ہواؤں اور نئے خیالات کے لیے بھی وا رکھے اور جدید رجحانات کو بھی لبیک کہا ہے۔ کلاسیکی روایت کی پاسداری کرنے والوں کے لیے یہ راہ کچھ کم خطرناک نہیں ہے اور اکثر کے ہاں اشعار چغلی کھاتے ہیں کہ جدیدیت کو فیشن کی طرح محض اوپر سے اوڑھ لیا گیا ہے۔ غوثیؔ نے نئے اثرات کو اشعار کی سطح پر قبول کرنے سے قبل انھیں اپنے لہو اور اپنے جذبے میں تحلیل کیا ہے ورنہ اس رنگ کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا:

چاند کہلا کے وہی خوش ہوں، میں جگنو ہی بھلا
للہ الحمد، مری اپنی چمک ہے مجھ میں،

تم نے دیکھا ہی نہیں دل کا دریچہ کھول کر
نور برساتا یقیناً سایۂ دیوار بھی

اب وہ سونے کا سہی، لیکن مرے کس کام کا
جس مکاں میں کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ نہ ہو

وہی ہے وارثِ لبِ تشنہ، جو رہِ حق میں
فرات کیا ہے، سمندر سے انحراف کرے

کوئی کھڑکی بھی نہیں اب تو، جو باقی رکھتی
میرے گھر سے مرے ہمسائے کے گھر کا رشتہ

دھواں دھواں نظر آتی ہے، بزمِ فن غوثیؔ
یہاں چراغ زیادہ ہیں، روشنی کم ہے

جوہر کو پرکھتے ہیں، اربابِ نظر، ورنہ
شیشہ بھی چمکتا ہے، ہیرا بھی چمکتا ہے

یقین کیجیے کہ ایسے شعر فیشن زدہ شعراء نہیں کہہ سکتے۔ یہاں عصری آگہی اور عصری حسیت کا روایت کے ساتھ جس فنکارانہ توازن کے ساتھ تال میل ہوا ہے، اسی سے ثابت ہے کہ شعر اندر سے اُگے ہیں اِدھر اُدھر سے نوچ کر لفظوں کی پھلواری نہیں سجائی گئی۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ جگنو کی طرح اپنی چمک پر چاند سے آنکھ ملانے والا، بغیر کھڑکی دروازے کے طلائی مکان سے گریز کرنے والا، تشنہ لبی کے باوصف سمندر کو ٹھوکر مارنے والا، ہمسائے کے گھر سے رشتہ برقرار رکھنے کا متمنی، چراغوں کی افراط میں روشنی کی قلت کا شاکی، اور شیشے اور ہیرے کو اربابِ نظر کی طرح پرکھنے والا یہ فنکار لب و لہجے اور خیال کی جدت و ندرت کے باوجود اپنے اشعار میں 'لِلّٰہ الحمد' جیسے ٹکڑے استعمال کرنے، دل کے دریچے اور اربابِ نظر جیسی تراکیب وضع کرتے ہوئے حجاب نہیں محسوس کرتا۔ "یہ زندہ روایت اور سچی جدیدیت کا خوبصورت سنگم ہے۔" بقول سلیم احمد "اچھی شاعری کلاسیکی یا رومانوی، روایتی یا جدید ہونے کی بناء پر اچھی نہیں ہوتی، دونوں طرح کی شاعری اچھی اور بری ہو سکتی ہے۔" اپنی طرف سے اس قول میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہوں گا کہ ان سب کی آمیزش سے بھی اچھی شاعری ممکن ہے۔ مثال اس کی غوث محمد غوثیؔ کا کلام ہے، جسے

پڑھنے کے بعد وہ لوگ جو شاعر کے کلام کو اس کے لیبل دیکھ کر پسند یا ناپسند کرتے ہیں سخت سراسیمہ ہوں گے کہ غوثیؔ نہ خالصتاً قدامت پرست ہیں نہ صریحاً جدید۔ وہ سکّہ بند نقّاد کو ایسے دوراہے پر لاکر کھڑا کر دیتے ہیں جہاں سمتوں کا تعین دشوار ہو، تارِ حریرِ دو رنگ کی تخلیق کردہ یہ شاعری اپنا منفرد ذائقہ رکھتی ہے جس سے حسبِ ذوق عوام بھی محظوظ ہو سکتے ہیں اور خواص بھی، نقّادوں کی بات نقّاد جانیں۔

مُظفّرؔ حنفی ۲۱ر جنوری سنہ ۱۹۸۴ء

سنہ ۱۹۵۰ء لغایۃ سنہ ۱۹۶۲ء

حمد

جس کا خلاصہ ہے بقا ، لاریب تو لاریب تو
اِطلاقِ لا سے مَاورا ، لاریب تو لاریب تو

آفاق و اَنفُس آشنا ، آگاہِ بیرون وخفا
تو ! قادرِ ہر دوسرا ، لاریب تو لاریب تو

کیا انبیاءؑ کیا اولیاء کیا اصفیائے باصفا
سب آئینوں کا آئنا ، لاریب تو لاریب تو

ہم کیا ہمارا علم کیا ، کیسی نظر ادراک کیا
ہر شے کا ہیئت آشنا ، لاریب تو لاریب تو

برحق ہے فرمانِ نبی ، کہتا ہے غوثی بھی یہی
میرا خدا ، سب کا خدا ، لاریب تو لاریب تو

(مئی ۸۴ء)

نعت شریف

بے شک وہ شہرِ علم، جو اُمّی خطاب تھا
حقّا، وہی خلاصۂ اُمّ الکتاب تھا

کیا ہو احاطۂ کرمِ رحمتِ تمام
وہ تو کریم کا کرم بے حساب تھا

ہم نشر کر رہے تھے زمانے میں درسِ حق
ہم تھے کتاب خواں، وہ ہماری کتاب تھا

اللہ رے وہ حسنِ فراوانِ ہاشمی
جو ذرّہ تھا جمال کشِ آفتاب تھا

منشاء تھا اس کا مہرِ نبوّت کو چوم لے
وہ جھوٹ بول کر ہی سہی، کامیاب تھا

ارشادِ مصطفےٰؐ تھا، بہ تائیدِ شانِ کُن
انگشتِ پاک اٹھی تھی کہ شق ماہتاب تھا

وہ شانِ حکم کیا تھی، اگر معجزہ نہ تھی
اک لمحہ میں "زوالِ عروجِ شراب" تھا

وہ ضبطِ یارِ غار، وہ کربِ گزندِ مار
کیا احترامِ خوابِ رسالت مآب تھا

غوثیؔ! فضا مدینہ اثر ہے، کہ بزم میں
اس کی مہک ہے، جس کا پسینہ گلاب تھا

(فروری ۱۹۸۲ء)

لاکھ ہوا خلاف ہو غم کا سوال ہی نہیں
جس کے وہ خود ہوں ناخدا ناؤ وہ ڈوبتی نہیں

جہد و عمل کی راہ میں بارشِ سنگ ہے تو کیا
سر کی شکستگی مرے دل کی شکستگی نہیں

آؤ کہ چشمِ غیر سے اپنا مشاہدہ کریں
دوست بھی ہیں بفضلہٖ بات بھی کچھ بری نہیں

میری نظر نے پالیا رازِ نگاہِ خشمگیں
شوق سے روٹھ جایئے شکوۂ برہمی نہیں

اصلِ حیات دوستو، فکر و عمل کا نام ہے
صرف دلوں کی دھڑکنیں مظہرِ زندگی نہیں

غوثیؔ ابھی ہے دم میں دم ہنس کے پئیں گے اشکِ غم
یوں بھی علاجِ رنج و غم صرف شراب ہی نہیں

(نومبر ۱۹۵۱ء)

جہاں اربابِ محفل خالی از دردِ جہاں ہوں گے
مرے نغمے وہاں ذوقِ سماعت پر گراں ہوں گے

رہِ ہستی میں جو ناواقفِ رمزِ جہاں ہوں گے
وہ میرِ کارواں کیا ہوں گے گردِ کارواں ہوں گے

فضائے دار میں سب لوگ آخر کیوں ہراساں ہیں
یہاں جو اہلِ دل ہوں گے انہیں کے امتحاں ہوں گے

مگر، چشمِ بصیرت چاہیئے اے ذوقِ نظارہ
اگر دل میں نہیں ہوں گے تو پھر جلوے کہاں ہوں گے

سوالِ بدگمانی کیوں اٹھے گا غیر لوگوں میں
جنہیں ہم سے محبت ہے، وہ ہم سے بدگماں ہوں گے

خلوصِ دوستاں پر ناز کرتے ہیں جو اے غوثیؔ
ضرور اک دن وہ "بربادِ خلوصِ دوستاں" ہوں گے

(جولائی ۱۹۵۱ء)

غزل بقیدِ یک قافیہ

جب سے دل پر عکس فرما آپ کی تنویر ہے
آئینے کا آئینہ، تصویر کی تصویر ہے

جیسے، الفاظ و بیاں کا، ایک سیلِ بیکراں
دم بہ خود یہ ان کا دیوانہ ہے، یا تصویر ہے

چشمِ صورت آشنا، ممنونِ احساں ہے مگر
آپ پھر بھی آپ ہیں، تصویر پھر تصویر ہے

پھول، حلقے میں لئے ہیں، برق کرتی ہے طواف
یہ ہمارے آشیاں کی، آخری تصویر ہے

دیکھئے تو سر سے پا تک، ایک تصویرِ وفا
کاش وہ، ایسے ہی ہوتے جیسی یہ تصویر ہے

ہر پریدہ رنگ، چہرے پر دھنک لے کر گیا
جانے یہ کس "کائناتِ رنگ" کی تصویر ہے

(نومبر ۸۱ء)

جو دستِ ناز میں آنے سے پہلے ٹوٹ جاتے ہیں
وہ پیمانے مرا جشنِ شکستِ دل مناتے ہیں

خداوندا! انھیں توفیق دے خود احتسابی کی
کہ جن کی ناخدائی میں سفینے ڈوب جاتے ہیں

خلوصِ دوستاں پر بھی ہیں سائے بدگمانی کے
قیامت ہے اندھیرے روشنی کو کھائے جاتے ہیں

یہ اک مبہم سا رشتہ بھی بڑی قدروں کا حامل ہے
میں جب پہلو بدلتا ہوں وہ اکثر چونک جاتے ہیں

جسے ہونا ہو، وہ ہو مرتکب کفرانِ نعمت کا
خدا کا نام لے کر ہم تو پیمانہ اٹھاتے ہیں

فضائے زندگی کجلا چلی ہے لوٹ لیں غوثیؔ
پرندوں کو سرِ شام اپنے مسکن یاد آتے ہیں

(فروری ۵۲ء)

نہ ہو اپنی نگاہوں میں جو اب بھی احترام اپنا
تو پھر کس وقت سمجھیں گے یہ دیوانے مقام اپنا

بحمدِ اللہ یوں تو جانِ میخانہ ہیں ہم لیکن
نہ رنگِ میکدہ اپنا نہ مَے اپنی نہ جام اپنا

مہ و خور کی تجلّی سے تجھے کیا فیض پہنچے گا
خود اپنی روشنی میں دیکھ دیوانے مقام اپنا

اگر فکر و عمل کو نیند آجانے کا خطرہ ہو
تو ایسے آشیاں ایسی بہاروں کو سلام اپنا

اگر یہ سہو کے سجدے نہیں جزوِ سیاست ہیں
تو بن سکتا ہے وجہِ "زخمِ پیشانی" امام اپنا

دلِ باغی میں ہم روحِ محبت پھونک دیتے ہیں
ذرا شائستہ ہے یارو "مذاقِ انتقام" اپنا

ہماری شاعری "تقویمِ پارینہ" سہی پھر بھی
کسی بنیاد پر قائم تو ہے یارو کلام اپنا

مشیت بڑھ کے، سر پر تاج رکھ دیتی ہے عظمت کا
یہ دیوانے جہاں پہچان جاتے ہیں مقام اپنا

نگاہِ لطف سے غوثیؔ ذرا محتاط ہی رہنا
کہ یہ نشتر بڑی تیزی سے کر جاتا ہے کام اپنا

(جنوری ۶۵۲ء)

(غزل بقیدِ یک قافیہ)

سب کچھ تو زندگی کی متاعِ سفر میں ہے
جب تم نظر میں ہو تو زمانہ نظر میں ہے

یوں بھی تو سوچ نازکشِ حسنِ دوستاں
تیرا بھی کچھ مقام کسی کی نظر میں ہے؟

پڑھ لیتے ہیں وہ سب کی نظر سے دلوں کا حال
اندر سے کون کیا ہے سب ان کی نظر میں ہے

کیوں ہو رہا ہے تجزیۂ جورِ ناروا
تصویر کا یہ رخ بھی کسی کی نظر میں ہے

یارو شکارِ وقت ہوں یا آسماں شکار
جو کچھ بھی ہوں سب اہلِ نظر کی نظر میں ہے

اب کیا شکایتِ روشِ دوستاں کروں
غوثیؔ مری کمی بھی تو میری نظر میں ہے

(فروری ۱۹۵۳ء)

عجیب قلب ہیں اہلِ وفا کے سینوں میں
پناہ دیتے ہیں سانپوں کو آستینوں میں

نگاہِ دوست کا آئینے سے تقابل کیا
وہ چہرہ خواں ہے، یہ بیچارہ چہرہ بینوں میں

گلوں کا خندۂ بیباک تازیانہ سہی
جنوں ترنگ بھی بھرتا ہے ان مہینوں میں

اُنھیں ہمارا شعورِ نظر بھی دے یارب
بڑا خلوصِ توجّہ ہے نکتہ چینوں میں

غریقِ کیفِ خودی ہیں ابھی تو دیدۂ و دل
ابھی شراب کہاں ہے ان آبگینوں میں

سفینے والو! وہ گرداب آزمودہ نہیں
ہوں محوِ خواب اگر ناخدا سفینوں میں

(جولائی ۱۹۵۳ء)

✥

کسی عنوان سہی اے کاش انہیں اپنا لیا ہوتا
زمانہ منحرف ہوتا تو ہو جانے دیا ہوتا

میں اپنا خون پینے کے لئے مجبور ہوں یارو
نہ میں حسّاس ہوتا اور نہ آپ اپنی سزا ہوتا

گرہ پڑتی ہی کیوں رشتوں کے اس تارِ حریری میں
اگر وہ ہم مزاجِ ناخنِ عقدہ کُشا ہوتا

یہ دیوانہ یقیناً ان کا دیوانہ نہیں ورنہ
پَرِ جبریل، بستر کی شکن بن کر پڑا ہوتا؟

دوبارہ آشیاں بندی سے ہم خود دست کش رہتے
اگر بجلی سے حقِّ آشیاں بھی جل گیا ہوتا

رکھی ہوتیں تمہاری انگلیاں نبضِ زمانہ پر
تو پھر ہر شعر اے غوثیؔ دُکھے دل کی صدا ہوتا

(جون ۱۹۵۳ء)

نصیبِ دل ہے اور شاید وداعِ زندگی تک ہے
وہ اک ٹوٹا ہوا رشتہ کسک جس کی ابھی تک ہے

مِلو سب سے مگر کچھ احتیاطاً فاصلہ رکھنا
کہ یارو سلسلہ ہر دوستی کا دشمنی تک ہے

مگر عہدِ وفا کرنے سے پہلے علم تھا کس کو
کہ یہ عہدِ وفا بس آنے والے موڑ ہی تک ہے

بہ ایں احساس جلووں سے بھی نظریں پھیر لیتا ہوں
کہ لطفِ جلوۂ جاناں نظر کی تشنگی تک ہے

تو پھر تا دیر شخصیت کا جادو چل نہیں سکتا
اگر عرضِ ہنر الفاظ کی جادوگری تک ہے

نرالے خواب اور تعبیر کا اک سلسلہ غوثیؔ
مری دیوانگی سے ہے، مری دیوانگی تک ہے

(اکتوبر ۵۳ء)

غرورِ جلوۂ عرفاں ہے دیکھئے کیا ہو
بڑے اندھیرے میں انساں ہے دیکھئے کیا ہو

چلے ہیں توڑنے زنداں کو چند دیوانے
سوالِ عظمتِ زنداں ہے دیکھئے کیا ہو

قریبِ شادیٔ مرگ آچلا ہے دیوانہ
نقاب سلسلہ جنباں ہے دیکھئے کیا ہو

صداقتیں بھی ہیں اب اِتّہام کی زد پر
بشر بشر سے گریزاں ہے دیکھئے کیا ہو

ہوائیں رُخ تو بدلنے لگی ہیں اے غوثیؔ
شبابِ جشنِ چراغاں ہے دیکھئے کیا ہو

(مارچ ۵۴ء)

بغیر غازہ بھی کیا جچ رہا ہے دیوانہ
کہاں سے ہاتھ لگی خاکِ پائے جانانہ

گرفتِ صبحِ طرب میں ہے، ظلمتِ شبِ غم
فروغِ شمعِ محبّت ہے، آفتابانہ

کہاں سے لائے ہیں ظالم، جوازِ عزّ و شرف
ہیں بے وقار تو کیا، نام تو ہے شاہانہ

تمہیں کھُلو، تو مرا رنگ روپ مجھ پر کھُلے
تمہیں ہو میری کسوٹی، تمہیں ہو پیمانہ

مری کمی پہ پہنچتی نہیں نظر میری
نگاہِ دوست ذرا اک نظر حریفانہ

حقیقتاً تو نہیں جزو و کُل جدا غوثیؔ
نگاہِ دوست مجازاً ہے مجھ سے بیگانہ

(ستمبر ۵۴ء)

خراجِ عزّ و شرف ملے گا جلالتِ زندگی ملے گی
یہاں جو نبّاضِ وقت ہو گا اسی کو اب سروری ملے گی

حرارتِ زندگی تھی جن میں وہ محفلیں تھیں مجاہدوں کی
یہ عیش والوں کی انجمن ہے یہاں کہیں زندگی ملے گی؟

یہ ظلمتوں کے دبیز پردے کہاں تک آخر پڑے رہیں گے
جو شمعِ فکر و عمل جلے گی تو لازمی روشنی ملے گی۔

نقیبِ فطرت کی حیثیت سے میں پھر یہ اعلان کر رہا ہوں
جسے شہادت کا شوق ہو گا اسے نئی زندگی ملے گی

نظر مشیّت کی پڑ رہی ہے ٹھہر ٹھہر کر تجھی پہ غوثیؔ
گمان غالب ہے زلفِ گیتی کی تجھ کو مشاطگی ملے گی

مئی ۵۵ء

(پوری غزل بقیدِ مطلع)

خوش فہمیوں سے رشتۂ غم آج کا نہیں
خوش فہمیوں کو پھر بھی کوئی چھوڑتا نہیں

مل بیٹھنے کا اب تو کہیں بھی مزا نہیں
سب چہرہ آشنا ہیں، مزاج آشنا نہیں

چھپ کر تو ہم نے وار کسی پر کیا نہیں
اے دوستو نہیں یہ ہماری ادا نہیں

دامن ہمارا کس سے کشادہ رہا نہیں
تاہم! جوابِ وسعتِ دامانِ لا نہیں

اب تک تو اس کا "جوہرِ ذاتی" کھلا نہیں
کیسے پرکھ ہو اس کی وہ ہیرا ہے یا نہیں

کیا دیکھئے کسی کو، کوئی آئینا نہیں
غوثیؔ یہ طرزِ فکر غلط ہے بجا نہیں

(فروری ۱۹۵۶ء)

نظر جلووں میں اتنی کھو چکی ہے
کہ سرتاپا تجلّی ہو گئی ہے

نئے در کھول دیتی ہیں فضائیں
جہاں فکرِ رسا پر تولتی ہے

ہمیں جس زاویے سے چاہو دیکھو
یہ تصویر اب مکمّل ہو گئی ہے

فرازِ دار ہو یا طورِ سینا
محبّت تو بلندی چاہتی ہے

ترے قدموں کی خاطر شش جہت سے
مری ہستی سمٹتی آ رہی ہے

جہاں تک کام کرتی ہیں نگاہیں
چراغِ آرزو کی روشنی ہے

سنور لے جتنا جی چاہے سنور لے
محبّت آئینہ دکھلا رہی ہے

دئے ہیں غمِ محبّت کی ہنسی نے
بہار آ کر یہ کانٹے بو گئی ہے

دھکیلا ہے کنویں میں اس کو جس نے
وہ دشمن ہی نہیں ہے، بھائی بھی ہے

پرائی آگ میں جل کر جو خوش ہو
وہی مستِ شرابِ آگہی ہے

وہ کب کے جا چکے ہیں پھر بھی غوثیؔ
وہی محویّتِ نظّارگی ہے

(جولائی ۵۶ء)

حیاتِ عشق کو اتنا تو "نورفام" کریں
مہ و نجوم ادب سے جسے سلام کریں

نظر مِلا کے جو کرتے ہیں بات سورج سے
وہ ڈوبتے ہوئے تاروں سے کیا کلام کریں

ابھی تو وقت ہے تزئینِ میکدہ کے لئے
بجائے رخنہ گری مِل کے کوئی کام کریں

اٹھو اٹھو کہ مشاغل ہیں اور بھی یارو
فسانۂ غمِ ماضی یہیں تمام کریں

بلندیوں سے پکارا گیا ہے یوں غوثیؔ
کہ اہلِ عشق بھی حاصل کوئی مقام کریں

(جون ۱۹۵۶ء)

خود کو تری جناب سمجھنے لگے ہیں لوگ
ذرّہ ہیں، آفتاب سمجھنے لگے ہیں لوگ

دھندلا چلے ہیں دیدہ و دل، پھر اُجال دو
تم کو خیال و خواب سمجھنے لگے ہیں لوگ

کچھ پھیل تو چلے ہیں نگاہوں کے دائرے
مفہومِ احتساب سمجھنے لگے ہیں لوگ

کیا پڑھ لیا ہے اک مرے چہرے سے دِل کا حال
سب کو کھلی کتاب سمجھنے لگے ہیں لوگ

تا چند چل سکے گا یہ جادو نقاب کا
حسنِ پسِ نقاب سمجھنے لگے ہیں لوگ

غوثیؔ کسی پہاڑ سے ناپو نہ اپنا قد
جو کچھ بھی ہیں جناب سمجھنے لگے ہیں لوگ

(جولائی ۷۵ء)

خرد "گماں مدار" تھی جبھی تو بے حضور ہے
جنوں "یقیں اساس" ہے تو کامیابِ نور ہے

نظر نظر پہ بار ہے ذکاوتِ نظر مری
میں آئنہ مزاج ہوں یہی مرا قصور ہے

پئیں گے جھوم جھوم کر مئے کشیدۂ نظر
یہ غازۂ حیات ہے، یہ زندگی کا نور ہے

یہ احتیاط اور ڈر ذرا ذرا سی بات پر
کہیں سہی، خلوص میں کوئی کمی ضرور ہے

جن آئنوں کی آنکھ نے دیا ہے حوصلہ مجھے
خطا اُن آئنوں کی ہے اگر مجھے غرور ہے

امین کیوں نہ بن سکا میں جلوۂ تمام کا
بجا ہے غوثیؔ آج اگر ملال دور دور ہے

(اگست ۶۵ء)

بنوں میں سُرخیٔ ہر اشتہار آخر کیوں
مری طرف ہی سے ہو پہلا وار آخر کیوں

ہمیں پہ سجتا ہے کیوں تاجِ عشق، تم سوچو
ہمیں ہیں صرف "زمانہ شکار" آخر کیوں

اگر یہ سچ ہے کہ مشرب ہے صلحِ کُل سب کا
تو پھر نفاق کے خنجر پہ دھار آخر کیوں

گھٹائیں جم کے برسنے تو دو محبّت کی
نہ دُھل سکے گا دِلوں کا غبار آخر کیوں

ضرر رساں ہیں وہ یادیں تو کردے "ذہن بدر"
ہے مبتلائے غم و انتشار آخر کیوں

اب "اعتکافِ انا" سے نکل بھی آ غوثیؔ
بنا ہوا ہے "غریبُ الدّیار" آخر کیوں

(جنوری ۱۹۵۸ء)

ہمارا سائباں ہے بالیقیں ہے
وہی جس کا کوئی سایہ نہیں ہے

بجھالو پیاس اپنے خنجروں کی
گلوئے خشک "دجلہ آفریں" ہے

مزاجاً شعلہ و شبنم ہیں احباب
گلے ملنے کی گنجائش نہیں ہے

کوئی آسان ہے، ان تک پہنچنا
بڑے کانٹے ہیں، پتھریلی زمیں ہے

خدا کا شکر ہے اپنا مقابل
کشادہ ذہن ہے باریک بیں ہے

جھلس جائے گا آنسو پینے والے
کہ یہ پانی مزاجاً آتشیں ہے

اڑا دیتا ہے سارے غم ہنسی میں
دلِ دیوانہ تجھ کو آفریں ہے

کھلے دل سے گلے مل کر یہ جانا
بڑا باغی مزاجِ آستیں ہے

جنوں پر تازیانے سے زیادہ
جبینِ ناز کی "قوسِ جبیں" ہے

محبت کو قبیلوں میں نہ بانٹو
محبّت کا کوئی مذہب نہیں ہے

وہ آئینہ، میں ان کا عکس غوثیؔ
کوئی پردہ کوئی دوری نہیں ہے

(مئی ۵۹ء)

(جگرؔ صاحب کی نذر کی گئی)

ضبطِ فریاد اگر حدِّ زیاں تک پہنچے
تو پہنچنے دو یہ آواز جہاں تک پہنچے

جادہ پیمائے محبت میں بہم عقل وجنوں
دیکھنا یہ ہے کہ اب کون کہاں تک پہنچے

سر پہ سورج تو ہمارے بھی تھا، لیکن ہم پر
اُسی بے سایہ کا سایہ تھا جہاں تک پہنچے

سوچتا ہوں کہ پھر اک بار پکاروں اُن کو
دیکھوں یہ آخری آواز کہاں تک پہنچے

جاگنے والو مؤذن کی خوش الحانی پر
کاش تم میں کوئی مفہومِ اذاں تک پہنچے

•

ہم تو نذرِ رسن و دار ہوئے ہم سفرو
جس کو توفیق جہاں تک ہو وہاں تک پہنچے

اُن کے ذہنوں پہ جمی برف نہ پگھلے شاید
جن کے گھر میں نہ کسی گھر کا دھواں تک پہنچے

وہ تو یہ کہئے کہ آنکھوں میں ہے کچھ جلوۂ دوست
ورنہ یہ ظلمتِ غم جانے کہاں تک پہنچے

نشر ہونے دو حدیثِ غمِ دل اے غوثیؔ
یہ تو خوشبو ہے پہنچنے دو جہاں تک پہنچے

(اپریل سنہ ۶۰ء)

غزل کو رنگِ تغزّل نیا دیا میں نے
اگرچہ داؤ پہ خود کو لگا دیا میں نے

خدا کا شکر ہے شفاف آئنہ بن کر
تمہیں تمہاری نظر سے دکھا دیا میں نے

میں بندگی کے نشیب و فراز کیا جانوں
جہاں بھی دل نے کہا سر جھکا دیا میں نے

عجب نہیں کہ اندھیرے سے تم بھی گھبراؤ
اگر چراغِ تمنّا بجھا دیا میں نے

اٹھا اٹھا کے نقاب ان کے روئے روشن سے
جہاں کو آئنہ خانہ بنا دیا میں نے

جدیدیت کو روایت کے احترام کے ساتھ
جو، بن پڑا وہ تصوّر سدا دیا میں نے

مجھے ہے نسبتِ روحِ بلالؓ اے یارو
زمانہ سویا ہوا تھا جگا دیا میں نے

بڑا شرف ہے کہ اے سنگ و خشت کے بندے
خدا سے تیرا تعارف کرا دیا میں نے

لہو میں تھی مرے "تاثیرِ قطبیت" غوثیؔ
فصیلِ عشق کو سیسہ پلا دیا میں نے

(ستمبر ۱۹۶۰ء)

اگر ہے پیشِ نظر اُن کے دل میں گھر کرنا
تو دل لگا کے طواف اپنا عمر بھر کرنا

ہے اعتبار جہاں کا تمہیں پہ دار و مدار
جب اعتبار کرو اپنی ذات پر کرنا

میسر آئے وہ خوشبو تو اے "غزالِ جنوں"
سدا سگندھ لٹاتے ہوئے سفر کرنا

اک آئنے کی طرح مجھ سے باخبر رہ کر
جہاں کمی نظر آئے مجھے خبر کرنا

تعلّقات بڑھیں ، کم تکلّفات بھی ہوں
مگر دریچے کو بھولے سے بھی نہ در کرنا

عذاب جاں تو نہ ہوگا ملالِ محرومی
کرو امید کسی سے تو مختصر کرنا

درست بھی ہو جو اندازۂ صلاحیّت
صلاحیت کی نمائش سے در گذر کرنا

کہاں میں اور کہاں آزمائشیں غوثیؔ
وہ چاہتے ہیں مجھے صاحبِ نظر کرنا

(اپریل ۱۹۶۱ء)

نہ ہوتے شاد آئینِ گلستاں دیکھنے والے
فسانہ بھی اگر پڑھ لیتے عنواں دیکھنے والے

ابھی تسکینِ خاطر کا کوئی امکاں نہیں یارو
ابھی بیمار ہیں نبضِ گلستاں دیکھنے والے

جو ممکن ہو، تم اپنے ہاتھ کی ریکھا کھرچ ڈالو
کہ ہم ہیں تو سہی، خواب پریشاں دیکھنے والے

تو پھر کیسی نظر بندی، طلسماتِ تدبّر کیا
جو خود کو دیکھ لیں جشنِ چراغاں دیکھنے والے

طلوعِ آفتابِ آگہی کیا خاک دیکھیں گے
حقارت سے مرا چاکِ گریباں دیکھنے والے

شکستِ ذوقِ نظارہ مقدّر ہی سہی غوثیؔ
انہیں دیکھیں گے پھر بھی "تابہ امکاں" دیکھنے والے

(۶۲ء)

ہر چند ابھی خود پر ظاہر ہیں اور مرے احباب نہیں
یاروں پہ فدا ہونے والے کم یاب سہی نایاب نہیں

دنیا کا بھرم قائم رکھنا، اوروں کے لئے جینا، مرنا
اس دور کی وہ تہذیب نہیں اس دور کے وہ آداب نہیں

کشتی پہ تھپیڑوں کا ہے اثر، تیکھے سہی موجوں کے تیور
پھر بھی پس منظر میں یارو سازش ہے کوئی گرداب نہیں

محبوب ادا، حیرت افزا، خوشبو سیرت، جلوہ صورت
یہ خواب ہمارے اپنے ہیں، یہ خواب پرائے خواب نہیں

ہر موج رواں بے فیض رہی بے سایہ شجر جیسی ابھری
دریا بھی "سراب آسا" نکلا اک لب تشنہ سیراب نہیں

بازارِ وفا اور بے رونق، یہ تو المیہ ہے غوثیؔ
ہیرے ہیں مگر خوش تاب نہیں، موتی ہیں مگر پر آب نہیں

(۲۵۶)

جب "نافۂ جاں" بن کر غم ان کا مہکتا ہے
آہوئے دل اپنے ہی سائے سے بھڑکتا ہے

اس شخص کی باتوں میں گو ربط نہیں لیکن
ماتھے کی لکیروں سے کردار جھلکتا ہے

جوہر کو پرکھتے ہیں اربابِ نظر ورنہ
ہیرا بھی چمکتا ہے، شیشہ بھی چمکتا ہے

کیا سرحدِ نظّارہ آپہنچی کہ آنکھوں میں
جگنو سے چمکتے ہیں، کوندا سا لپکتا ہے

ہیں ضبطِ مسلسل سے سب "مہر بلب" پھر بھی
جذبوں کا لہو ہونا، چہروں سے جھلکتا ہے

ساقی "اثرِ صہبا" ہے اپنی جگہ لیکن
الطافِ خصوصی پر مے خوار بہکتا ہے

دیوانے کا، مٹھی میں، دابا ہوا پتھر بھی
بڑھتے ہوئے فتنے کا رُخ موڑ تو سکتا ہے

شایانِ مصائب ہے اپنا ہی دل اے غوثیؔ
آغوش میں شعلوں کے کندن ہی دمکتا ہے

(مارچ ۱۹۶۳ء)

گیسو اور مانگ

وہ سیہ گیسو اور اُس پر مانگ کا حسنِ سلیم
وادیٔ ظلمات میں گویا صراطِ مستقیم

جس طرح رچ جائے جلوہ، دیدۂ بے نور میں
جس طرح اک شمع کافوری شبِ دیجور میں

ہے غمِ فرقت میں کوئی سیم تن بے سدھ پڑی
آبنوسی قاب میں یا موتیوں کی ہے لڑی

یا سوادِ ناامیدی میں، کرن امید کی
یا کہیں ظلمت اثر موجوں میں، کوئی جل پری

مَن اگل کر، ناگ ہیں گویا قطار اندر قطار
یا اماوس کے اندھیرے میں کھِلے بن کی بہار

سنگ موسیٰ کی چٹانوں میں وجودِ جوئے شیر
قلبِ اسود میں ہے گویا کوئی نورانی لکیر

سُرمئی ماحول میں دم دار تارے کا سماں
بادلوں کی سیج پر سوئی ہوئی برقِ تپاں

اتصالِ موجۂ ناممکنات و ممکنات
موت کے ہاتھوں میں گویا ساغرِ آبِ حیات

زینتِ آغوشِ شب ہے بنتِ خورشیدِ سحر
یا پئے فنکار غوثیؔ ارتباطِ خیر و شر

گھپ اندھیرے میں درخشاں جادۂ رفرف سوار
لشکرِ اغیار میں جیسے علیؓ کی ذوالفقار

یا کسی کے دیدۂ شائستہ کا ذوقِ نظر
یا کوئی بچھڑا ہوا جلوہ فرازِ طور پر

(نومبر ۶۵ء)

سنہ ۱۹۶۶ء لغایت سنہ ۱۹۷۵ء

چھوڑے گا نہ پھر یارو ہنگامۂ غم تنہا
صہبائے خودی پی کر ہو لیں کوئی دم تنہا

ساقی! نہ اٹھا پردے چہرے سے حقیقت کے
ہم کو نہ ملا ہم سے، رہ جائیں گے ہم تنہا

دنیا میں جو امرت ہو مل بانٹ کے پی جاؤ
ہم وقت کے شنکر ہیں پی جائیں گے سم تنہا

جو سیکڑوں ہاتھوں کی محنت سے پھلا پھولا
وہ باغ اُجاڑ آیا اک سبز قدم تنہا

دیوانگیٔ دل پر، بے چارگیٔ دل پر
ہنستے ہیں تو ہم تنہا، روتے ہیں تو ہم تنہا

خود ہی نہ کوئی جاگے شہزادۂ دل جب تک
رکھنا ہے ہمیں غوثیؔ دنیا کا بھرم تنہا

(فروری ۶۶ء)

برقِ جلوہ سے ابھی شعلہ بجاں ہوتی ہے
دیکھتے رہیئے، نظر کیسے دھواں ہوتی ہے

زندگی، بن کے ابھرتی ہے نیا شیش محل
جب تری یاد چراغِ دل و جاں ہوتی ہے

خود سے ملنے کی تمنّا تو بہت ہے لیکن
کبھی مِل بیٹھیں یہ توفیق کہاں ہوتی ہے

جب کسی طرح سنورتی ہی نہیں زلفِ جہاں
چشمِ عالم مری جانب نگراں ہوتی ہے

خود بھی رکھیئے بھرم آئینۂ شخصیّت کا
رہی کردار کی توقیر تو "ہاں" ہوتی ہے

ہمہ اوقات سہی بارشِ انوار مگر
تشنۂ شوق کی تسکین کہاں ہوتی ہے

دیدۂ ذہنِ رسا، سے تو نہیں چھپ سکتی
صورتِ دل جو پسِ لفظ و بیاں ہوتی ہے

نازک اتنا ہے مزاجِ دلِ حسّاس کہ بس
بے محل چشمِ عنایت بھی گراں ہوتی ہے

ہم قلندر ہیں، یہی علم بہت ہے غوثیؔ
دوستی بے خبرِ سود و زیاں ہوتی ہے

(جولائی ۶۷ء)

"غزل بروزنِ رُباعی"

تھے بھیڑ یں سب شکوہ کُناں دیکھ آے
بس نام کی اونچی تھی دکاں دیکھ آے

قد ناپتے ہیں سب کا، تو اپنا سایہ
اندازِ وسیع النظراں دیکھ آے

کل، ساتھ نہ دے گی مری قسمت یارو
تم اتنی بلندی پہ کہاں دیکھ آے

ناپید ہوئے بے شَجرہ فن پارے
بازار کی ایک ایک دکاں دیکھ آے

تاروں کا سماں راہِ وفا میں، کیا خوب
شاید وہ "رمِ ریگِ رواں" دیکھ آئے

جو پہنچے وہاں جاگتی آنکھیں لے کر
اک سلسلۂ خوابِ گراں دیکھ آئے

مانگے کے اجالوں پہ گذر ہوتی ہے
ہم شانِ مہ و کاہ کشاں دیکھ آئے

مسکن تھے جو اُن سنگ زنوں کے غوثیؔ
اب کیا ہیں وہ شیشے کے مکاں دیکھ آئے

(اکتوبر ۶۷ء)

ہے لطف میں کمی سی کچھ ایسا، لگا مجھے
اے اعتبارِ دوست، یہ کیا ہوگیا مجھے

خوشبوئے زلفِ یار ملی مست کرگئی
کیسی تھکن، سفر میں مزہ آگیا مجھے

نفرت سے نفرتوں کا دیا بھی کہاں جواب
تم سے پڑھا ہوا وہ سبق یاد تھا مجھے

آئینہ بے ذکاوتِ حس آئنہ کہاں
پتھر بنا دے گر نہیں دیتا جلا مجھے

میں درخورِ جوابِ محبّت نہیں تو کیوں
اے چشمِ ناز، یوں بھی ذرا دیکھنا مجھے

لا دیکھتا چلوں ترا آئینۂ جمال
خود سے ملے ہوئے بھی زمانہ ہوا مجھے

بس ختم کر زمانۂ زریں کی راگنی ؛
اے وقت یوں نہ میری نظر سے گرا مجھے

کس پر اساسِ رنگِ گلستاں رکھی گئی؟
کس پھول کی مہک ہوں، کبھی سوچنا مجھے

مجھ میں ہی دھڑکنیں ہیں دلِ کائنات کی
جب میں تری غزل ہوں، تو پھر گنگنا مجھے

غوثیؔ میں اک صحیفۂ عرضِ ہنر بھی تھا
لوگوں نے اشتہار سمجھ کر پڑھا مجھے

(فروری ۶۸ء)

تمھارا دل تو ہمارے سبھاؤ جیسا ہے
ہٹا کے چہرے سے چہرہ دکھاؤ جیسا ہے

وہ چوکتا ہی نہیں جس پہ داؤ جیسا ہے
ہمیں خبر ہے وہاں رکھ رکھاؤ جیسا ہے

مجھے دھکیل کر اس کا ضمیر جاگ اٹھا
اب اس کا حال بھی طوفاں میں ناؤ جیسا ہے

تو کیا وہ دستِ مشیّت کا شاہکار نہیں
پرانا یار ہے یارو! نبھاؤ جیسا ہے

سنہرے خواب دکھایے نہ آپ ہی دیکھے
ہمارا یار "ہمارے سبھاؤ" جیسا ہے

ابھر رہی ہیں نئے خون میں نئی قدریں
خلوص میں بھی گھماؤ پھراؤ جیسا ہے

یہ اور بات کہ دم دے رہا ہو سوزِ دروں
بجھا ہوا وہ بظاہر الاؤ جیسا ہے

کھلے گا خود وہ کسی روز مثلِ بندِ قبا
نہ چھپ سکے گا، لہو میں رچاؤ، جیسا ہے

وہ اس کا حالِ زبوں اس پہ خندۂ بے باک
حسیں سماج کے چہرے پہ گھاؤ جیسا ہے

ہے اپنی پیٹھ کا ہر زخم آئنہ غوثیؔ
مرے رفیقوں کو مجھ سے لگاؤ جیسا ہے

(جون ۶۸ء)

جس نے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی ہے
وہ مرے درد کے رشتے سے مرا بھائی ہے

جانے اب کون ہوا سنگِ ملامت کا شکار
جانے میدان میں دنیا کسے لے آئی ہے

کس کا چہرہ ہے پسِ چہرہ، ہے سب آئینہ
ہم فقیروں نے کچھ ایسی ہی نظر پائی ہے

شوخئ غم نے، مری چھاپ لگا دی اُن پر
اب میں جی بھر کے ہنسوں گا مری بن آئی ہے

مجھ پہ یہ طرفہ ستم ہے کہ مری بربادی
روشنی میں مرے احباب کو لے آئی ہے

خود شناسی کے لئے خود نگری ہے لازم
اب تو ہم نے بھی انہیں کی روش اپنائی ہے

حسبِ سابق ہے تری راہ میں دنیا حائل
پھر وہی ہم ہیں، وہی معرکہ آرائی ہے

کاش! اُن کو بھی کوئی خلعتِ کردار ملے
میری تبلیغ جنہیں دار پہ لے آئی ہے

زیب دیتا ہے اُنہیں حاشیہ آرا ہونا
ہم پہ یاروں کا بڑا قرضِ شناسائی ہے

دوست روتے ہیں تو آتی ہے ہنسی اے غوثیؔ
اتنا غم کب ہے، مجھے جتنی پذیرائی ہے

(مارچ ۱۹۶۹ء)

جو مثلِ تیر، چلا تھا، کمان سا، خم ہے
نگاہِ دوست میں تاثیرِ اسمِ اعظم ہے

خوشا کہ وہ ہیں مرے روبہ رو بہ نفسِ نفیس
زہے، کہ آج مری آرزو، مجسّم ہے

محیطِ حسن گراں تا کراں، نہیں نہ سہی
بساطِ شیشۂ دل جس قدر ہے، تاہم ہے

انا پسند! انا کے نشے میں بھول گئے
یہ شہد وہ ہے کہ جس کے خمیر میں سم ہے

ہوا سے کرنا ہے باتیں، تری مہک پاکر
ترے "غزالِ جنوں" میں بلا کا دم خم ہے

یہ رنگ و نور یہ خوشبو یہ کیف سامانی
حریم ناز ہے یا "عالموں کا عالم" ہے

نہ جا تبسّمِ لب ہائے خشک پر اے دوست
ہنسی نہیں یہ "ترقی پسند" ماتم ہے

تو کیا چراغِ تمنّا کا میں محافظ ہوں
جب ان کو فکر نہیں ہے ہمیں کسے غم ہے

مرا مزاج ہے، یاروں پہ وار دوں خود کو
مرا وجود بھی "انگشتری کا نیلم" ہے

دُھواں دُھواں نظر آتی ہے بزمِ فن غوثیؔ
یہاں چراغ زیادہ ہیں، روشنی کم ہے

(اگست ۶۹ء)

✲

حضورِ دوست ہجومِ تحیّرات لئے
میں خود کو ڈھونڈ رہا ہوں، شعورِ ذات لئے

نقاب ڈال دے اے وقت سب کے چہروں پر
نجانے کون ہو زہرِ غمِ حیات لئے

مرا چراغِ وفا ظلمتوں میں ڈوب گیا
جب آئی یاد تری "شمعِ واقعات" لئے

وہاں حدیثِ غمِ کائنات، کون سنے
ہر اک بشر ہو جہاں اپنے غم کی بات لئے

میں جیسے، اپنے قبیلے میں، بے قبیلہ ہوں
جمالِ تاج لئے، حسنِ سومنات لئے

ہوائے قُرب چلی، گردِ غم چھٹی، پھر بھی
ہر آئنہ ہے "غبارِ تعلقات" لئے

جہانِ عشق سے، حرماں نصیب دیوانہ
سمٹ گیا ہے اک آنسو میں، کائنات لئے

مراقبے سے کب اٹھے گا اے نقیبِ حرم
وہ منتظر ہیں، پیامِ تجلّیات لئے

ترے نقوشِ در و بام، رنگ مانگیں تو
ہیں اپنے قلب و جگر، دجلہ و فرات لئے

بس اک لطافتِ سجدہ ہے، اور ہم غوثیؔ
الگ ہیں سب سے "سرِ آستاں صفات" لئے

(مئی سنہ ء)

کسی کے وار سے محفوظ کوئی یار نہیں
بڑا غضب ہے کہ رشتوں کا اعتبار نہیں

اداشناسِ زمانہ سہی مری نظریں
تمہیں سمجھ لوں، ابھی اتنا ہوشیار نہیں

یہ شہرِ زندہ دلاں ہے کہ پتھروں کا نگر
کوئی نقاب کشائے جمالِ یار نہیں

نہ آرزوئے ستائش نہ فکرِ سود وزیاں
میں مطمئن ہوں مرا کوئی کاروبار نہیں

امیرِ شہرِ طرب کیا ہوئے، کہ آنکھوں سے
پرانے خوابوں کے رشتے بھی استوار نہیں

خدا کا شکر ہے غوثیؔ کہ دامنِ کردار
مسک گیا ہے، دریدہ ہے، داغدار نہیں

(اکتوبر ۱۹۷۱ء)

ہم اپنے دوست بھی اپنے رقیب ہو کر بھی
کھُلی کتاب رہے ہیں عجیب ہو کر بھی

اِسی لگن سے حدیثِ وفا سنائیں گے
بذاتِ خود بھی تمھارے نقیب ہو کر بھی

ہمیں لٹائیں گے یارو، خلوص کے موتی
ہمیں ہیں دل کے سمندر، غریب ہو کر بھی

تم آئینہ ہو تو پھر کیوں سنور کے دیکھ نہ لیں
بطورِ خاص، تمھارا نصیب ہو کر بھی

بلندیوں ہی نے روشن کیا ہمیں ورنہ
بجھے پڑے تھے "چراغِ صلیب" ہو کر بھی

شریف خون ہے جن کی رگوں میں اے غوثیؔ
وقار دوست رہیں گے، رقیب ہو کر بھی

(اگست ۱۹۸۲ء)

حصارِ کاسۂ سر توڑ کر نکل آئے
طلب ہوئی تھی، تو سجدوں کے پَر نکل آئے

ہر اک ضمیر سے پردہ اٹھا گئے پتھّر
کسی کے عیب، کسی کے ہنر نکل آئے

سنور سنور کے مشیت سنوارتی ہے جنھیں
اِدھر تو کوئی نہیں ہم کدھر نکل آئے

مرا خروشِ جنوں، جب بھی رنگ پاش ہوا
مری طرف نگراں کتنے در نکل آئے

کہاں ہے ہولی، جو دیکھے بیک کرشمہ دوکار
گِھرے تھے آگ میں ہم بھی، مگر نکل آئے

بہ ایں نزاکتِ تخلیق، ٹھوکریں کھانے
یہ پتھروں میں کہاں شیشہ گر نکل آئے

فرازِ منزلِ رف رف سوار کی سوگند
خلاء میں اور "بصیرت کے پَر" نکل آئے

لبِ فرات، عجب شانِ سرفرازی تھی
گماں تھا، دشت میں نیزوں کے سر نکل آئے

ہے آگہی بھی اگر جاں گسل تو ہو غوثیؔ
حریمِ بے خبری سے مگر نکل آئے

(جون ۱۹۷۶ء)

اب تو خود سے بھی کچھ ایسا ہے بشر کا رشتہ
جیسے پرواز سے، ٹوٹے ہوئے پَر کا رشتہ

موڑ آنے دو ابھی سامنے آجائے گا
کیا ہے آپس میں رفیقانِ سفر کا رشتہ

میرے ہاتھوں کی لکیریں یہ بتاتی ہیں مجھے
پتھروں ہی سے رہے گا مرے سر کا رشتہ

تم فرشتے ہی سہی نظریں نہ بدلو یارو
کیا فرشتوں سے نہیں کوئی بشر کا رشتہ؟

سب کے اندازِ نظر کو نظر انداز کیا
اب اُنہیں تک ہے مری فکر و نظر کا رشتہ

ہاں مگر ٹوٹے ہوئے خواب کی صورت نہ جڑا
ان کی راہوں سے مرے پائے سفر رشتہ

تو مرے چاکِ گریباں کو نیا سورج دے
جوڑ جاؤں میں دھندلکوں سے سحر کا رشتہ

کوئی کھڑکی بھی نہیں اب تو جو باقی رکھتی
مرے گھر سے مرے ہمسائے کے گھر کا رشتہ

سب کے چہروں کی خراشیں ہیں نظر میں غوثیؔ
آئنوں سے ہے دلِ آئنہ گر کا رشتہ

(اپریل ۷۲ء)

جم کر جب ان کی یاد کا بادل برس گیا
ایک ایک پل گذار کے ایک اک برس گیا

دیوانہ لاکھ سوزِ دروں سے جھلس گیا
آئی شکن جبیں پہ نہ باتوں کا رس گیا

حق بات پر ہوں راندۂ درگاہِ دوستاں
میری وفا کا ناگ مجھے خود ہی ڈس گیا

لُو دے اٹھیں ہیں جب بھی وہ چشمانِ حق نگر
ہر صاحبِ نقاب کا چہرہ جھلس گیا

یہ حال ہے تو سمجھو اب آئے مِلن کے دن
دل کا تو خون پی کے یہ پہلا برس گیا

وہ آئنہ نہیں ہے تو آنکھوں کے باوجود
میں خود کو دیکھنے کے لئے بھی ترس گیا

دامن پہ کس نے چاند ستارے سجا لئے
دنیا کو خاک دے کے غبارِ ہوس گیا

میرے لئے بھی "فتنۂ سیماب پا" تھا دل
دِل سے ملی نجات غمِ پیش و پس گیا

اجداد امیرِ شہرِ وفا آپ ہی کے تھے
آج اک فقیر ہم پہ یہ آوازہ کس گیا

کیا جانے کس بزرگ کا غوثیؔ پہ ہاتھ ہے
زنداں یہ کس گلاب کی خوشبو سے بس گیا

(مئی ۷۳ء)

وہ مستِ نشّہ اگر پھر ہے رنگ آمادہ
تو اب میں صلح طلب ہوں نہ جنگ آمادہ

جنوں کا نازِ سلامت روی غلط ہی سہی
خرد وروں کے قدم کیوں ہیں لنگ آمادہ

فضا میں ٹوٹے ستاروں کی طرح گم ہوں گے
یہ پَر سمیٹنے والے یہ ننگ آمادہ

گئے وہ دن کہ فضا میں گلال اڑتا تھا
نہ اب وہ رنگ طلب ہیں نہ رنگ آمادہ

مرے سکوتِ یقیں پر وہ چپ رہا ورنہ
تھا اس کا سازِ گماں شور و شنگ آمادہ

غریب، دل کی گھٹن میں، حواس کھو بیٹھا
ہے دوستوں کی ہوا سے بھی جنگ آمادہ

کچھ اقربا بھی پسِ پردۂ غبار رہے
کچھ اپنا شیشۂ دِل بھی تھا زنگ آمادہ

جنوں کی رُت ہے، تو کھِل کر کوئی شگوفہ سر
وہ رنگ دے کہ زمانہ ہو رنگ آمادہ

یہی تو وقت ہے غوثیؔ "خود احتسابی" کا
گدازِ قلب ہے خلقت میں، سنگ آمادہ

(جولائی ۷۴ء)

کیا حسنِ آگہی تھا میں گویا نشے میں تھا
جو ہر بڑے غضب کا ترے آئینے میں تھا

میرے سفر کی سمت جہاں بھی غلط ہوئی
دیوار بن کے خود وہ مرے راستے میں تھا

ہاں پھر سنا، وہ آیتِ کیفِ تجلّیات
ہاں اے نگارِ زیست، میں کس مرحلے میں تھا

کیسی پناہ کیسی تھکن، اب بھی سوچ لے
حائل درخت، کل بھی ترے مرتبے میں تھا

گزری تمام عمر نشیب و فراز میں
گویا ازل سے تا بہ ابد، پالنے میں تھا

میں بے ضمیر ہو کے کسی کا نہ ہو سکا
لوگوں سے اختلاف اسی مسئلے میں تھا

میرا جنوں مذاق بنا بھی تو کیا ہوا
میں تو انہیں کے بس میں انہیں کے کہے میں تھا

میں تھا، اداشناسِ حضوری حضورِ دوست
سر حلقۂ جنوں تھا، مگر راستے میں تھا

برسوں ہوائیں دوش پہ مجھ کو لیئے پھریں
خوشبو کی طرح کوئی "مرے حافظے" میں تھا

غوثیؔ سوادِ قرب میں یہ تجربہ ہوا
لوگوں کی دوستی کا بھرم، فاصلے میں تھا

(اکتوبر ۷۴ء)

کج کلاہِ عشق تھا وہ، شان سے زندہ رہا
پتھروں میں تن کے "شیشوں کا نمائندہ" رہا

جب فضا گردِ گماں سے پاک ہو، تب دیکھنا
کس کی قسمت کا ستارہ کتنا تابندہ رہا

اور سوزِ بدگمانی کا تدارک تھا بھی کیا
چین سے خوش فہمیوں کے سائے میں زندہ رہا

خواب خوش کُن ہیں مگر یارو بطورِ احتیاط
آنے والے کل کا باقی ذکر آئندہ رہا

تھی کہیں اتنی حضوری کی تڑپ؟ شاید نہ تھی
عمر بھر "سیماب آسا" میں ہی رقصندہ رہا

گو مرے ماحول کی کمزوریوں کا ذکر تھا
بے خطا ہو کر بھی میں تا دیر شرمندہ رہا

کل، یقیناً پھر خوش آئے گا تمھیں میرا وجود
بھائی بن کر ہی ملوں گا، کل اگر زندہ رہا

شکر ہے غوثیؔ کہ مجھ جیسا قلندر عمر بھر
ایک "شہرِ علم و حکمت" کا نمائندہ رہا

(اپریل ۱۹۷۵ء)

سوکھے ہوئے لبوں کی ہنسی بھی ہنسی تو ہے
حالاتِ حاضرہ پہ کھُلا طنز بھی تو ہے

ہوں گے لہو لہان اگر دست وپا تو ہوں
جو فصل بو چکے ہیں ہمیں کاٹنی تو ہے

موقعہ ملے تو ہنسنا ہنسانا نہ چھوڑیے
دل پر عذابِ کشمکشِ زندگی تو ہے

وہ حبس تھا کہ سانس بھی لینا محال تھا
ہلکی سہی ہوائے محبت چلی تو ہے

یارو مسافرت میں، تھکن اور تپش کے ساتھ
اپنا حریف سایۂ دیوار بھی تو ہے

نیلام بھائیوں کے سبب ہو رہا ہے وہ
کیا ہے یہ لطفِ حسنِ خدا داد ہی تو ہے

اب شہرِ جاں میں نور کا فقدان کیوں نہ ہو
مدّت ہوئی دریچۂ دل بند بھی تو ہے

اُس دن، جلالِ برقِ تجلّی ہی ٹھیک تھا
اب غیرتِ نگاہ بھی کچھ سوچتی تو ہے

غوثیؔ کسی میں کوئی کمی ہو نہ ہو مگر
یارانِ خودپسند کا انداز ہی تو ہے

(جولائی ۷۵ء)

جب نہیں غازہ دہِ امروز کوئی پَل ترا
آج ہیں ڈھل جائے گا ہر آنے والا کَل ترا

چکھ لیا "شہدِ سوادِ خانقاہی" کا مزہ
فکر کے بازو بھی شل پائے عمل بھی شل ترا

ایک پتھر بھی مرے سر تک رسا ہونا نہیں
کس بلندی پر ہے، اے شاخِ اَنا یہ پھل ترا

اب مزہ زور آزمائی کا کہاں باقی رہا
تیری مٹھی کھُل پڑی آئینہ ہے کس بَل ترا

یوں سمجھ لے، گنبدِ بے در ہے بہ شہرِ خرد
راگ کا ہے کو سنے گا کوئی اے پاگل ترا

نرگسِ بیمار تجھ پہ کس کا جادو چل گیا
پھول سے رخسار پر پھیلا ہے کیوں کاجل ترا

وقت کی ہنگامہ خیزی میں بھی اے جانِ جہاں
لَو لگا کر ذکر کر لیتے ہیں پل دو پَل ترا

تیرا "منظورِ نظر" ہے آئینہ خانہ مگر
میری نظروں میں یہی قاتل ترا، مَقتل ترا

جب یہ آنسو " غازۂ حسنِ بصیرت" ہیں تو پھر
شکر کی ساعت میں کیوں لہجہ ہوا بوجھل ترا

بوریا تھا" روکشِ فتحِ مبیں" غوثیؔ مگر
یہ لباسِ فاخرہ، یہ بسترِ مخمل ترا

(ستمبر ۷۵ء)

مرا ضمیر اگر مجھ سے اختلاف کرے
تو جرم ہے یہ سیاست خدا معاف کرے

وہی ہے وارثِ لب تشنہ، جو رہِ حق میں
فرات کیا ہے، سمندر سے انحراف کرے

ہے اپنے قد سے بہت اونچی اس کی شخصیت
جو لغزشوں کا کھلے دل سے اعتراف کرے

چبھے گی آنکھ میں ایک اک خراش چہرے کی
وہ آئینے سے "غبارِ گماں" کو صاف کرے

ہے اب تو تیغ بکف غیظ میں وہ کوہِ گماں
اب اپنا کام "نگاہِ گماں شگاف" کرے

خود آگہی کی بشارت میں ناچ اٹھا ہے لہو
رُکے یہ رقص، تو غوثیؔ ترا طواف کرے

(اپریل سنہ ۷۶ء)

سنہ ۱۹۷۹ء لغایتہ سنہ ۱۹۸۴ء

منتشر "شہزادگانِ دل" کا شیرازہ نہ ہو
کاش یاروں کی ہنسی "فتنوں کا غمازہ" نہ ہو

اب وہ سونے کا سہی لیکن مرے کس کام کا
جس مکاں میں کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ نہ ہو

وہ جواں خون، اور اس پر نشّۂ دیدہ وری
کیا کریں وہ بھی جو میرے غم کا اندازہ نہ ہو

یاد ہے کچھ، تم نے کل خاکہ اڑایا تھا مرا
پھول سی آنکھوں میں شبنم، کل کا خمیازہ نہ ہو

پھر جنوں کیوں کر سجے دنیا کو کیسے رنگ دے
باعثِ تحریک اگر یاروں کا آوازہ نہ ہو

کاش میرے غم کا سایہ بھی رہے اپنوں سے دور
کاش اب یک جا، مری یادوں کا شیرازہ نہ ہو

آ گلے ملنے سے پہلے، کیوں نہ مل کر دیکھ لیں
دل کے نہ خانے میں کوئی "چور دروازہ" نہ ہو

وہ تو مُردہ ہیں، انھیں احساس کی خوشبو سے کیا
اپنے "اندازِ نظر" کا جن کو اندازہ نہ ہو

کاش اے غوثیؔ "زمانے بھر کا بچپن" لوٹ آئے
سب کے چہروں پر "حقیقی نور" ہو غازہ نہ ہو

(فروری ۱۹۷۹ء)

فضا میں عطر کہاں ہے، کہاں گُلال گیا
سب آئینہ تھے تو پھر گرد کون اچھال گیا

دروغِ مصلحت آمیز بھی، کرشمہ تھا
نہ جانے کتنے سروں سے وبال ٹال گیا

لہو کی جوت جگا کر مرا خروشِ جنوں
ترے نگر کا ہر اک راستہ اجال گیا

فراتِ میکدۂ تشنگی ہوا ثابت
وہ ریگ زار کے ساغر میں ایسی ڈھال گیا

کہاں کہاں کی مہک ہے مرے خیالوں میں
کہاں کہاں مجھے لے کر ترا خیال گیا

بلند رکھنا تھا مجھ کو مرے حریفوں میں
وہ مجھ پہ نقطۂ اوجِ صلیب اُچھال گیا

مآل سامنے ہے جنگِ حق و باطل کا
جو آئنہ تھا وہی بن کے تیری ڈھال گیا

سبھی عظیم ہو یارو، تو کیوں نہ کُھل کے کہو
کہاں ضمیر کی آواز، کون ٹال گیا

لہو تھا گرم تمھارا، اُبل پڑے، لیکن
تعلقات کا وہ "حسنِ اعتدال" گیا

بڑے غضب کا "ستارہ شناس" ہے غوثیؔ
جو تیرے حق میں، ترا زائچہ نکال گیا

(مئی ۷۹ء)

جب تقدّس نہ ہو، آنکھوں کو گراں لگتا ہے
نقشِ سجدہ بھی، جراحت کا نشاں لگتا ہے

کیا تعجب، وہ چٹانوں سے بھی لیتا ہو خراج
دور سے جو تمھیں شیشے کا مکاں لگتا ہے

میں نے "بیدار نگاہوں" کو جو سونپا تھا کبھی
خیر سے اب وہ مرا خواب، جواں لگتا ہے

لیجے "خورشیدِ یقیں" لینے لگا انگڑائی
وہ جو "ہالہ سا" پسِ وہم و گماں لگتا ہے

کیف پرور یہ فضائیں یہ مہکتی ہوئی شام
بر لبِ دل پہ کوئی زمزمہ خواں لگتا ہے

ان سے نسبت کا شرف ہے کہ ازل سے یارو
مجھ سا ذرّہ بھی "پہاڑوں کو گراں" لگتا ہے

کاش کوئی اُسی اندازِ تعلق سے بڑھے
اب بھی اخلاص طلب، سارا جہاں لگتا ہے

میں تو آئینہ ہوں، پتھر کا جگر دے یارب
ٹھیس لگنے سے مجھے، سب کا زیاں لگتا ہے

بھاؤ کھلتا، ہے جہاں جنسِ وفا کا یارو
ہم سے پوچھو کہ وہ بازار کہاں لگتا ہے

اُف یہ آندھی یہ چراغِ تہِ داماں غوثیؔ
لو بڑھاتا ہوں تو "آنکھوں میں دھواں" لگتا ہے

رنگ پر ہے طالبِ جلوہ بھی حسنِ یار بھی
رت جگے ہونے لگے، کھُلنے لگے اسرار بھی

یورشِ جلوہ تھی، کٹ کر رہ گئی تابِ نظر
تیز تھی تلوار سے، بہتی ندی کی دھار بھی

خانقاہی میں بھی رنگ شہر یاری کھُل گیا
جزوِ لازم بن چلے ہیں حاشیہ بردار بھی

تم نے دیکھا ہی نہیں دل کا دریچہ کھول کر
نور برساتا یقیناً سایۂ دیوار بھی

ہار کیوں مانی، سپر کیوں ڈال دی مت پوچھیئے
کیا ضروری ہے کہ ہو ہر بات کا اظہار بھی

خام کاروں میں کہاں تھی تاب، کیا دیتا جواب
میرا ہاتھ اٹھتا تو بھرپور ہوتا وار بھی

اپنے احساسِ وفا کو ان کے غم کو کیا کہیں
پاؤں کی زنجیر بھی ہے، اور گلے کا ہار بھی

موتیوں سے ہو رہا ہے اُوس کے قطروں کا مول
دیدنی بازار بھی ہے، گرمیٔ بازار بھی

حلقۂ بادہ کشانِ غم میں، دیوانہ ترا
دائرے کا حسن بھی ہے، نقطۂ پرکار بھی

غوثیؔ اِس "طرفہ کرم" پر شکر کے سجدے کرو
دل ہے اب "غارِ حرا" بھی جلوہ گاہِ یار بھی

(اپریل ۸۰ء)

❋

کیا ہوا اُن سے اگر داد نہ پائی، اک عُمر
خود مجھی تک نہ ہوئی میری رسائی اک عُمر

بات اتنی تھی کہ خانوں میں بٹوں یا نہ بٹوں
مجھ سے ہر روز رہی میری لڑائی اک عُمر

اُن کے جلووں نے خد و خال اُجالے ورنہ
زندگی صرف ہیولیٰ نظر آئی، اک عُمر

تب کہیں جا کے میں شرمندۂ احساس ہوا
خاک اڑائی تھی مجھے، خاک اُڑائی، اک عُمر

اختلافِ نظریّات لڑائی تو نہیں
اک جہاں نے تری تصویر بنائی اک عُمر

جیسے وہ خار نہ تھے پھول تھے چن لیتا کوئی
چپ رہا لطفِ کشِ آبلہ پائی اک عمر

زندگی ! ہم بھی مجاہد ہی کہے جائیں گے
کون ہے جس نے تری بات بنائی اک عمر

گوشِ احساس میں، لہجے کی گرہ کھلنے دے
شہد گھولے گی مری تلخ نوائی اک عمر

جادۂ صدق و صفا کیا تھا اک آئینہ تھا
زندگی نور کے دریا میں نہائی اک عمر

شرحِ گل کاری جلوہ کی لگن میں غوثیؔ
کتنی آنکھوں کا رہا "رنگ حنائی" اک عمر

جولائی ۱۹۸۰ء

میں بھی دیکھوں کہ سرِ راہِ وفا، کتنے ہیں
اور ہیں بھی تو "مرے قد سے سوا" کتنے ہیں

سوزِ ہر آبلۂ غم کو جو کردیں کافور
وہ مسیحا وہ "حِنا بند" بتا کتنے ہیں

زندگی! تو تو پُراسرار نہ بن، اُن جیسی
اک ذرا اپنے نئے روپ دکھا، کتنے ہیں

کِس کے ہمراہ چلا اِتنا، کوئی مست خرام
ہمقدم میرے "نقوشِ کفِ پا" کتنے ہیں

لہ اردو شاعری میں "حنا" کا یہ استعمال آپ کی توجہ چاہے گا۔ (غوثی)

ایک اک بھاری ہے سو سو پہ، غلط یہ بھی نہیں
اور سچ یہ بھی ہے اب اہلِ وفا، کتنے ہیں

اک خبر ہے، کہ بڑی شے ہیں بڑے قد آور
آؤ دیکھ آئیں انھیں، چیز ہیں کیا، کتنے ہیں

ایک رُخ ایک ہی انداز نہیں جلووں کا
ہوش اڑاتے ہیں تو کیا، ہوش فزا کتنے ہیں

واقعی کیا طلبِ جنسِ وفا ہے تجھ کو
اس طرف آکے ذرا جیب دکھا، کتنے ہیں

جن کا انصاف ہو انصافِ خدا اے غوثیؔ
آج وہ "منصفِ پیوند قبا" کتنے ہیں

(مارچ ۱۹۸۰ء)

نقطۂ کُن ، حاصلِ تحریر، شاید میں ہی تھا
حسنِ عالم ساز کی تفسیر، شاید میں ہی تھا

تھے مظاہر ذات کے ، زعمِ اُلوہیت لئے
اُن مظاہر میں تو بے تقصیر، شاید میں ہی تھا

ورنہ کیوں قائم رہا، اپنا ہی پندارِ انا
کاروانِ فکروفن کا میر، شاید میں ہی تھا

خواب ہی اُن کا مقدر تھے، جہانگیری کے خواب
لیکن اُن کے خواب کی تعبیر، شاید میں ہی تھا

غالباً تم ہی مُحرّک تھے مری انگڑائی کے
میں ہی تھا، خوش کامِ جوئے شیر، شاید میں ہی تھا

کون سہہ لیتا مسلسل، گرمیٔ حسنِ تمام
اعتبارِ شیشۂ تصویر، شاید میں ہی تھا

خود فریبی میں کسے فکرِ مآلِ جشن تھی
قہقہوں کے درمیاں "دلگیر" شاید میں ہی تھا

درد کے رشتوں پہ قائم کب تھے احبابِ کرام
پاسدارِ رشتۂ زنجیر، شاید میں ہی تھا

ہو نہ ہو کمزور تھی مجھ پر ہی، خود میری گرفت
ورنہ اپنا بھی "گریباں گیر" شاید میں ہی تھا

غوثیؔ ان جوہر شناس آنکھوں میں اب تک ہے چمک
خاکدانِ عشق میں "اکسیر" شاید میں ہی تھا

ستمبر ۸۳ء

ردیف کو ایک خاص التزام کے ساتھ برتنے کی سعی

اک راگ کی دو راگنی، فرزانگی، دیوانگی
اک برف سی، اک آگ سی، فرزانگی، دیوانگی

ساری حلاوت بے چسک، جب تک نہ ہو شامل نمک
پھر اک جھلک اے زندگی، فرزانگی، دیوانگی

ہوں خواب آنکھوں میں سجے، تعبیر کے ہوں ولولے
تب گُل کترتے آئے گی، فرزانگی، دیوانگی

نغمہ بہ نغمہ نَے بہ نَے، محفل بہ محفل پے بہ پے
اک زندگی، اک روشنی، فرزانگی، دیوانگی

ذہنوں پہ کتنے در کھلے، کیا رنگ تھے کیسے کھلے
ہم رقص جب دل سے ہوئی، فرزانگی، دیوانگی

اک جھیل سی ٹھہری ہوئی، اک تیز رو سیلاب سی
آئینہ ہے آئینہ بھی، فرزانگی، دیوانگی

محبوبۂ کونین بھی، جملہ دلوں کا چین بھی
مجموعۂ ضدّین بھی، فرزانگی، دیوانگی

ہر موڑ پر ہر دیوِ غم چومے گا اے غوثیؔ قدم
شیشے میں ہیں دو دو پری، فرزانگی، دیوانگی

(جون ۱۹۸۱ء)

وہ یقیں پیکر، ہے کس کا نور دیدہ ؟ کون ہے ؟
ظلمتِ شب میں "چراغ آسا" دمیدہ کون ہے ؟

گردِ جادہ کون ہے ؟ منزل رسیدہ کون ہے ؟
وقت کیا کہتا ہے سنیئے "برگزیدہ" کون ہے ؟

زہرِ غم پی، جزو جاں کر، پھر بھی موت آئے تو کیا
یوں بھی امرت کا یہاں "لذت چشیدہ" کون ہے ؟

فرش سے تا عرش یکساں ہے صدائے مرحبا
دیکھنا یہ سر بکف، یہ سر بریدہ، کون ہے ؟

بات کرتے ہیں تو منہ سے دودھ کی آتی ہے بُو
اُن میں اپنی محفلوں کا "رنگ دیدہ" کون ہے ؟

خاک سے پاکر مَفَر کس کو نہ خوش آیا سفر
دل گرفتہ کون ہے، خاطر کبیدہ کون ہے؟

اپنے سائے پر ہی جب مرکوز تھے ذہن و نظر
کوئی کیوں کر دیکھتا "قامت کشیدہ" کون ہے؟

جب دُرِ کردار پر آنچ آگئی، کیا رہ گیا
اب یہ "صرفِ ماتمِ رنگِ پریدہ" کون ہے؟

کس قدر شائستگی سے کہہ گیا وہ اپنا غم
دوستوں کی خیر ہو "دشمن گزیدہ" کون ہے؟

غم نہ کر غوثیؔ اگر مُردہ نہیں، تیرا ضمیر
تجھ سے بڑھ کر خود ترا "دیدہ شنیدہ" کون ہے؟

(اگست ۱۹۸۱ء)

دنیا تج کر ویرانوں میں کیوں جائیں رنجیدہ لوگ
جینے کے گُر سکھلا دیں گے ہم حالات گزیدہ لوگ

اُن کا دامن تھام کے دیکھو، خوشبو میں بس جاؤ گے
دست کشیدہ یوں بیٹھے ہو گویا دست بریدہ لوگ

مجبوری میں بھی یاروں کی دلداری کیوں فرمائیں
مطلب سے گرویدہ ہوں جب یاروں کے گرویدہ لوگ

رنگ فشانِ عالم بن کر دنیا پر چھا جاتے ہیں
جن پر اپنی چھاپ لگا دیتے ہیں رنگ پریدہ لوگ

جانے کس دل سے ملتے تھے ہم جیسے دیوانوں سے
آج بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں ذہنوں سے چسپیدہ لوگ

اُن کے قول و عمل کی وحدت، اسمِ اعظم تھی ورنہ
دنیا کی شیرازہ بندی اور پوشاک دریدہ لوگ

ساقی ہم کیا اور ہمارا علم ہی کیا جو لب کھولیں
جیسی تیری محفل یکتا ویسے چیدہ چیدہ لوگ

شہر علی گڑھ میں اک شاعر غوث محمد غوثیؔ ہے
کیا یہ سچ ہے، شوق سے اُس کو سنتے ہیں سنجیدہ لوگ

(اکتوبر ۱۹۸۱ء)

✥

غرورِ ناز دکھا، تجھ میں کتنا جوھر ہے
مرا خلوص بھی دریا نہیں سمندر ہے

پرکھ یہی ہے محبّت کی آنچ دو اُس کو
پگھل گیا تو وہ ہیرا ہے ورنہ پتھر ہے

ثبوتِ بیعتِ پیرِ حرم یہ ہے تو سہی
کہ آج بھی "کفِ دستِ رسا" منوّر ہے

خلا نورد کو یارو فرازِ منزل کیا
کہ اب تو اُس کا ہر اک "پَر" بجائے "شہپر" ہے

یقینِ ذات مکمّل نہیں تو کچھ بھی نہیں
نہیں تو علمِ خرد، جہل کے برابر ہے

مزاج و مصرفِ خار و گل، ایک سا تو نہیں
موازنہ نہ کرو، کون کس سے بہتر ہے

وہ مہرباں ہیں، تو آئینہ بن، شکستہ ہو
کہ دیکھنے کا مزہ، ٹوٹ کر، بکھر کر ہے

مجھے ضرورتِ غازہ نہیں، کہ چہرے پر
مرے ضمیر کا جو رنگ ہے، اُجاگر ہے

ستارۂ سحر آثار ہے جو اے غوثیؔ
غبار بستہ، ابھی اس کا پیش منظر ہے

(فروری ۱۹۸۲ء)

جزو اپنا ہی سمجھتا ہوں ، جہاں پر جو ہے
دل مرا ، عالمِ امکاں کے برابر ، جو ہے

للہ الحمد ، کمی کیا ہے ، چلو لوٹ چلیں
اپنا احساس ہی " جبریل کا شہپر" جو ہے

دل تو یوں بھی تھا اٹل " قطب سلیقہ" جو تھا
اب اٹل یوں ہے ترے " گھاٹ کا پتھر" جو ہے

دل سے پارس کی پرکھ اور یہ لوہا اے دوست
آستیں میں " یہ سپنولے " کے برابر جو ہے

تم شناور ہو مرے " خیر" میں دریا ہی سہی
موجزن میری رگ و پے میں ، سمندر جو ہے

زخمۂ سازِ محبّت بھی بنا کر دیکھو
کسی دشمن کے لئے ہاتھ میں خنجر، جو ہے

امرِ لازم ہے وہ عزّت ہو کہ ذلّت یارو
وہی ملنا ہے اُسے، جس کا مقدّر، جو ہے

صاف طینت بھی ہیں احباب مگر کیا کیجے
اس کا "آئینۂ احساس" مکدّر جو ہے

کوئی دریا ہو، تو کچھ شور کرے، راز کھُلے
ان کا دیوانہ ہے خاموش "سمندر" جو ہے

اُن کا ہر لفظ نہ کیوں دل پہ رقم ہو غوثیؔ
اُن کا ارشاد "صحیفے کے برابر" جو ہے

(اکتوبر ۸۲ء)

صورتِ ردِ بلا، شانوں پہ اپنے سر، جو تھے
ہم کو دنیا دیکھتی تھی، ہم نئے منظر جو تھے

کوئی جوہر ہی نہ تھا ان میں تو کیا کرتے غریب
زندگی بھر ٹھوکروں ہی میں رہے، پتھر جو تھے

زہرِ قاتل کو، بدلنا ہی پڑا اپنا مزاج
اک طرف ابنِ ولیدؓ اور اک طرف "شنکر" جو تھے

میرے چہرے کی خراشیں کوئی کیوں کر دیکھتا
میرے حق میں میرے آنسو "قیمتی چادر" جو تھے

خونِ دل، تلوار دشمن کی تو کیا پیتی، مگر
دوستوں کی آستینوں میں "چھپے خنجر" جو تھے

جس طرح معصوم بچّے، مصلحت نا آشنا
ان کے دیوانے، وہی باہر بھی تھے، اندر جو تھے

دیکھ لے اے وقت! ان کی چشمِ فیض آثار سے
موم بن کر رہ گئے آہن جو تھے، پتھر جو تھے

ان کے چاروں سمت، انہیں کی شہرتوں کی گونج تھی
وہ کہ اپنے ذہن و دل سے، گنبدِ بے در جو تھے

نقطۂ پرکار کن لیکن محیطِ خشک و تر
ہم نے دیکھے ہیں وہ ذرّے "آسماں پیکر" جو تھے

اور پھر کرتے بھی کیا غوثیؔ بجز خونِ انا
ہم ہی اپنے "نیزۂ احساس" کی زد پر جو تھے

(اکتوبر ۸۲ء)

ڈاکٹر وحید اختر صاحب کی نذر

یہ آج کیا ہے کہ باہم دگر ہیں نابستہ
تجلیات سے کم کل تک تھی چشم وابستہ

خرد سے نابہ جنوں سر بہ سر ادا بستہ
میں دائرے کی صفت پھیل کر بھی تھا، بستہ

یہی وہ عقدہ کشایانِ زلفِ گیتی ہیں ؟
پڑے ہوئے ہیں جو زنداں میں دست و پابستہ

مرے چراغ سے روشن ہوں، صد ہزار چراغ
دعا کرو کہ رہوں میں یونہیں وفا بستہ

مگر وہ غازۂ "رخسارۂ بہار" تو ہے
لہو جو میری رگوں میں نہ رہ سکا بستہ

چھنک رہے ہیں رگ و پے میں، گھونگرو جیسے
ہے اپنے گوشِ سماعت سے وہ صدا لبتہ

بنامِ حبِّ علیؓ جب ملے، تو راز کھلا
نہ میں ہوائے خودی میں، نہ وہ انا لبتہ

عجب نہیں ہو وہاں فرشِ راہ دیدۂ شوق
وگرنہ کیوں "پرِ جبریل" ہو گیا لبتہ

وہ آندھیاں ہیں کہ سینے ہیں شق پہاڑوں کے
ترا کرم ہے، کہ ذرّوں کی ہے ہوا لبتہ

مرا وجود بھی غوثیؔ ہے، نقطۂ پرکار
کہ دائرے کا ہوں مختار، پھر بھی پا لبتہ

(جنوری ۸۳ء)

عزیزی آشفتہ چنگیزی کی فرمائش پر

روحِ غالب کی نذر

یاروں سے خواہ کوئی کسی موڑ پر ملے
اے کاش تجربوں کی خلش بھول کر ملے

لفظوں کا کیوں زیاں ہو فرشتوں کے شہر میں
جب تک نہ ان کو ذہن و زبانِ بشر ملے

قدریں جدا جدا ہیں زمانے جدا جُدا
دشوار ہے کسی کو کسی کی خبر ملے

جب جب بھری اڑان، زمیں بوس ہو گیا
اے کاش اُسے بھی کوئی "فلک سیر" پَر ملے

کنکر تو میرے پاؤں کے چھالوں نے چن لئے
شیشے کی طرح کیوں نہ تری رہ گذر ملے

شاید یہ ضربِ سنگِ صداقت نہ سہہ سکے
شاید یہ تیرا شیش محل "کل" کھنڈر ملے

رشتوں کے زخم، روح کے ناسور بن نہ جائیں
زخموں کو بھول جانا، پڑوسی اگر ملے

عجلت کے فیصلوں کا زمانے سے درس لو
پتھر بھی پھینک لینا، جو شیشے کا گھر ملے

آنکھیں ہیں سب کی بند "غبارِ شکوک" سے
آندھی رُکے، تو دیکھنے والی نظر ملے

پھر کیا ملا جوابِ محبت، نہ پوچھئے
یاروں سے ہم تو جب بھی ملے ٹوٹ کر ملے

غوثیؔ! وہ اپنے چہرے پڑھیں بھی، تو کس طرح
آئینہ ہوں، تو اپنی نظر سے نظر ملے

(اکتوبر ۸۳ء)

(ردیف کو ایک نازک رُخ دے کر التزام کے ساتھ برتنے کی سعی)

تسلسلِ لطفِ خاص ہی تھا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا
جب آگیا، دیکھنا، سمجھنا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

کہاں تھا اِتنا شعورِ جلوہ، میں کم نظر، کم دماغ جو تھا
بلندیوں سے سلام آیا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

ہوا ہوئے کیوں رفیق میکر، تو کیا وہ سب کاغذی تھے چہرے
گذر گیا جب ہوا کا جھونکا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

پہاڑ جیسے مرے ارادے، وہ کون ہے جس نے توڑ ڈالے
شکست نے بارہا جھنجوڑا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

نہ پرسشِ غم نہ اشک شوئی، ہے سچ نہیں ہے کسی کا کوئی
ہوا بھری انجمن میں تنہا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

غبارِ حالات تھا غضب کا، بنا ہوا تھا دبیز پردہ
غبارِ حالات سے جو نکلا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

تجملِ آئنہ میں کھو کر، تحمّلِ آئنہ سمو کر
نقاب اٹھایا کہ حق تھا میرا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

اک آرزو تھی کہ خود کو دیکھوں، بھلا میں کیسا ہوں اور کیا ہوں
حضور کو آئنہ بنایا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

مرا ہی دامن تہی ہے غوثیؔ مجھی میں ہے جو کمی ہے غوثیؔ
شعورِ چشم و دماغ جاگا، تو میں نے دیکھا، تو میں نے سمجھا

(نومبر ۸۳ء)

✤

ناج سا ہوں کہ ایلورا کی جھلک ہے مجھ میں
رنگ جو کچھ ہے مرا آپ ہی تک، ہے مجھ میں

رشکِ فردوس نہ ہوتا مرا ویرانۂ دل
گلِ احساس کھِلا ہے، تو مہک ہے مجھ میں

اِسی نکتے میں ہے پوشیدہ، مرا مستقبل
میں جہاں ہوں مرے "ماضی کی جھلک" ہے مجھ میں

کوئی چونکا تھا کبھی عرضِ ہنر پر میرے
یہ تو کچھ آپ کے "لہجے کی کھنک" ہے مجھ میں

نکھرا نکھرا افقِ زیست پہ یہ رنگِ ملال
میرے بچھڑے ہوئے سورج کی دھنک ہے مجھ میں

جیسے پر مل گئے مجھ کو، میں اڑا جاتا ہوں
کیا ہے یہ، تیری کشش ہے کہ لپک ہے مجھ میں

چاند کہلا کے وہی خوش ہوں، میں جگنو ہی بھلا
للہ الحمد، مری اپنی چمک، ہے مجھ میں

جب ان آنکھوں کی کسوٹی پہ چمک دیکھوں گا
تب میں سمجھوں گا کہ سونا ہوں، دمک ہے مجھ میں

لاکھ فولاد اثر ہے مری فطرت غوثیؔ
پھر بھی تلوار کے مانند، لچک ہے مجھ میں

(فروری ۱۹۸۴ء)

(غزل بروزنِ رُباعی)

نظّارگیٔ لامتناہی دے گا
وہ نقش بہ دیوار بنا ہی دے گا

آنسو ہی سہی ہیں تو محبّت کی عطا
پی جا کہ یہ "مشروب" مزا ہی دے گا

روشن ہو کسی کا بھی، چراغِ شہرت
احباب کے چہروں کو، سیاہی دے گا

نادار ہے لاکھ آپ کا ممنونِ کرم
قسطوں میں سہی قرض چکا ہی دے گا

احساس کے انصاف سے مشکل ہے مفر
مجرم کو وہ سولی پہ چڑھا ہی دے گا

جیسے، کوئی کہتا تھا کنویں میں مجھ سے
جا تجھ کو خدا "مسندِ شاہی" دے گا

حالات گزیدہ ہے وہ، اس سے ملئے
اب زاویۂ فکر، نیا ہی دے گا

بخشا ہے جنہیں جذبۂ خوش پروازی
وہ، ان کو پر و بالِ ہما ہی دے گا

تشہیر خود اپنی کوئی کرتا ہے، کرے
وہ ظرف جو خالی ہے، صدا ہی دے گا

اقدار کو مٹی میں ملانے والا
یاروں کو "نگینہ" تو بنا ہی دے گا

کیوں داؤ پہ رکھتا ہے بھرم، جا گھر جا
کیا نشّے میں سب مال گنوا ہی دے گا

نیکی کا کوئی بیج ہی بو دیں غوثیؔ
سائے میں جو بیٹھے گا، دعا ہی دے گا

(جولائی ۸۴ء)

نعت شریف

پڑے تھے قعرِ مذلت میں پھر بھی دیوانے
اگرچہ ہاتھ بڑھایا تھا "عرش پیما" نے

زمانہ خود کو پرکھ لے بہ اُسوۂ حسنہ
خدائی بھر میں یہی، معتبر ہیں پیمانے

اگر ہو وردِ زباں، دل سے آپؐ کا کلمہ
تو کیا مجال کہ دنیا ہمیں نہ گردانے

یہ ساکنانِ حرم کس طرف چلے آئے
جہاں ہے شمع، وہیں لوٹ جائیں پروانے

وہی انیسِ حقیقت، وہی جلیسِ مجاز
شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

یہاں رسائیِ لفظ و بیاں کہاں غوثیؔ
وہ آئینہ ہیں کہ آئینہ گر، خدا جانے

(مارچ ۵۵ء)

"عکسِ آئینہ" حاضر ہے۔ قارئین کرام کے
پُرخلوص اور مفید مشوروں کا انتظار رہے گا۔
تاکہ اپنے دوسرے شعری مجموعے میں ان امور کا بھی
لحاظ رکھا جاسکے جو انشاء اللہ جلد پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔

مِری نظر میں تو آتی نہیں کمی اپنی
نگاہِ دوست ذرا اک نظر حریفانہ

غوثی